معظم علی

حصہ اول

نسیم حجازی

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

(اقبالؒ)

انٹرنیٹ ایڈیشن دوم سال 2006 www.Nayaab.Net

ترتیب

پیش لفظ	03
پہلا باب	06
دوسرا باب	40
تیسرا باب	64
چوتھا باب	90
پانچواں باب	104
چھٹا باب	135
ساتواں باب	156
آٹھواں باب	185
نواں باب	223
دسواں باب	244
گیارھواں باب	270

پیش لفظ

گزشتہ چار سال کے عرصے میں، میں ان تمام خطوط کے جواب نہیں لکھ سکا۔ جو میری تصانیف سے دل چسپی رکھنے والے حضرات نے بھیجے ہیں۔ان خطوط میں اس قسم کے چند فقرے بار بار دہرائے گئے ہیں:____ ''نیا ناول کب شائع ہو گا۔ ____؟ اس کا عنوان اور تاریخی پس منظر کیا ہے ____ اتنی دیر کیوں لگائی ____؟ کچھ لکھ بھی رہے ہو یا نہیں؟''

یہ خطوط انتہائی محبت اور خلوص سے لکھے جاتے تھے لیکن میرے پاس ان سوالات کا کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو ہر خط کا جواب لکھنے کے لیے جس فراغت کی ضرورت تھی، وہ مجھے میسر نہ تھی۔میں اپنے احباب کے سامنے اپنی ذاتی پریشانیوں یا الجھنوں کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔یہ سطور صرف ان حضرات کو مطمئن کرنے کے لیے لکھی جا رہی ہیں، جو اپنے خطوط کا جواب نہ پا کر مجھ سے متعدد بار بے اعتنائی کا گلہ کر چکے ہیں۔

''آخری معرکہ'' مکمل کرنے کے بعد مجھے جن الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان میں تو کچھ قدرت کی طرف سے تھیں اور کچھ اپنی پیدا کردہ تھیں۔جن احباب ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر میری نگرانی میں ایک روزنامہ اخبار جاری کرنے پر مصر تھے اور میں انہیں یہ جواب نہ دے سکا کہ مجھے ملک وملت کے مسائل سے زیادہ اپنی تصانیف سے دل چسپی ہے ______ چنانچہ میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور ۱۹۵۳ء میں راولپنڈی سے روزنامہ ''کوہستان'' جاری کیا گیا۔اس مہم میں میرا ساتھ دینے والوں کو اپنے مالی مسائل سے زیادہ اپنی محنت اور خلوص پر بھروسہ تھا۔قریباً ایک سال میری تمام تر توجہ ''کوہستان'' پر مرکوز رہی۔پھر جب مجھے

اطمینان ہونے لگا کہ ''کوہستان'' اپنی ابتدائی زندگی کے نازک مراحل سے گزر چکا ہے اور میں اپنی نئی تصنیف کی طرف توجہ دے سکتا ہوں تو میری اہلیہ بیمار ہو گئیں اور میں نے جو ابتدائی صفحات لکھے تھے، وہ چند مہینے میری دراز کی زینت بنے رہے۔ ۱۹۵۵ء کے وسط میں خدا نے میری اہلیہ کو شفا دی اور میں نے دوبارہ اپنا کام شروع کیا۔ عام حالات میں ایک ناول ختم کرنے کے لیے مجھے چھ سات مہینے کافی ہوتے ہیں لیکن اس کتاب کی راہ میں جو مراحل پیش آئے، وہ میری توقع سے کہیں زیادہ صبر آزما تھے۔

نئی کتاب کے لیے قلم اٹھاتے وقت میرے پیش نظر سلطان فتح علی ٹیپوؒ کی عظیم شخصیت تھی۔ میرے احباب نے چند برس قبل جس شدت کے ساتھ مجھ سے محمد بن قاسمؒ کے متعلق کچھ لکھنے کا مطالبہ کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ وہ میسور کے اس رجل عظیم کے متعلق لکھنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ نئے ناول کا خاکہ میرے ذہن میں تھا، لیکن جب میں نے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں ایک بہت بڑے کام کو ہاتھ لگا چکا ہوں۔ میں نے دور سے ایک پہاڑ دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس پہاڑ کو قریب سے دیکھنے کے بعد اپنے قارئین کے سامنے ایک خوش نما تصویر پیش کرسکوں گا لیکن جوں جوں میں اس کے قریب جا رہا تھا، اس کی بلندی، اس کی دل فریبی اور رعنائی اور اس کی وسعت اور ہیبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں وہ آبشار، وہ چشمے، وہ ندیاں اور وہ دریا موجود تھے جو مجھے دور سے نظر نہ آتے تھے۔ پھر اس پہاڑی کی بلندی سے مجھے چاروں طرف وہ بھیانک غار، وہ چٹیل میدان، وہ دلدل اور وہ بے آب و گیاہ صحرا دکھائی دیتے تھے جن کے تذکروں کے بغیر اس پہاڑ کے جلال و عظمت کی داستان نامکمل محسوس ہوتی تھی، میرے

نزدیک سلطان ٹیپوؒ کی سرگزشت ایک فرد کی سرگزشت نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی قوم کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے جس کے حصے کی بہترین آرزوئیں، امنگیں، حوصلے، اور ولولے سمٹ کر ایک رجلِ عظیم کے سینے میں جمع ہو گئے تھے۔

''معظم علی'' انہی آرزوؤں، امیدوں اور ولولوں کی داستان ہے اور میں نے اس ناول میں ان مہیب آندھیوں اور طوفانوں کا ذکر کیا ہے، جن کے درمیاں سلطان ٹیپوؒ شخصیت روشنی کے ایک مینار کی طرح دکھائی دیتی ہے۔اس کے بیشتر کردار میسور سے زیادہ بنگال کی تاریخ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں جب ملت کے شہیدوں کی لاشوں پر وطن فروش اپنے اقتدار کی مسندیں آرستہ کر رہے تھے۔

معظم علی اس داستان کا مرکزی کردار ہے۔میں نے اس کے احساسات کے آئینے میں اس زوال پذیر قوم کی سیرت و کردار کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جسے موت و حیات کی کش مکش میں کسی نجات دہندہ کی تلاش تھی۔معظم علی مرشد آباد سے اس وقت نکلتا ہے، جب بنگال میں آزادی اور حریت کے پرچم سرنگوں ہو جاتے ہیں اور مہیب تاریکیوں میں بھٹکنے کی بعد میسور کی سرزمین میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب کہ وہاں ایک نئی صبح کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

اس آفتاب کا عروج، اس کی درخشندگی و تابانی اور پھر اس کا غروب میری آئندہ تصنیف ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کا پس منظر ہے۔الفاظ دیگر ''معظم علی'' اس خراج عقیدت کی پہلی قسط ہے جو میں سلطان شہید علیہ الرحمتہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

چند ماہ قبل میں نے اس کتاب کے لیے ''آخری حصار'' عنوان پسند کیا تھا اور اس سلسلے میں میرے پبلشر کا اعلان بھی شائع ہو چکا تھا لیکن مسودہ پر نظر ثانی کے بعد مجھے ''معظم علی'' زیادہ موزوں نظر آتا ہے☆

نسیم حجازی ایبٹ آباد 15 فروری ۱۹۵۷ء

پہلا باب

معظم علی مرشد آباد کے قید خانے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔اس کی ماضی کی داستان ان امیدوں، آرزوؤں، حوصلوں، اور ولولوں کی داستان تھی جو پلاسی کے میدان میں دارج الدولہ کی شکست کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔زندگی کے دامن میں اب ان کے لیے مہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پہلے بھی مرشد آباد سے کوسوں دور ایک قید خانے میں رہ چکا تھا۔لیکن وہاں اپنی تاریک کوٹھری میں وہ اس مرشد آباد کا تصور کرسکتا تھا جس کا ہر گوشہ قوسِ قزح کی انگینیوں سے لبریز تھا۔حال کی تلخیاں اسے مستقبل کی مسرتوں کا پیغام دے سکتی تھیں ۔اسیری کی رات کے تاریک پردے اٹھا کر وہ صبح آزادی کے آفتاب کی سنہری کرنیں دیکھ سکتا تھا۔اڑیسہ کی سرحد کے پار وہ قید خانہ اس کے راستے کی ایک منزل تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی دن اس منزل سے گزر کر وہ پھر اس دنیا میں پہنچ جائے گا، جہاں زندگی کی مسکراہٹیں اس کے استقبال کے لیے موجود ہیں،لیکن مرشد آباد میں اس کی اسیری کا زمانہ ان ستاروں کی جلملاہٹ سے محروم تھا جو تاریک رات کے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں۔

کوٹھری کی دیوار میں چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روزن تھا اور قید کے ابتدائی ایام میں اس روزن سے سورج کی شعاعیں اسے دنیا کا پیغام دیا کرتی تھیں جہاں ابھی تک امید کا ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔وہ تصور میں اپنے ماحول کی بھیانک تاریکیوں سے نکل کر اس مکان کی چاردیواری میں جا پہنچتا جو اس کی موہوم امیدوں کی آخری جائے پناہ تھا۔وہ ان کمروں کا طوائف کرتا جہاں کبھی مسرت کے قہقہے گونجے تھے۔اچانک فرحت مکان کے کسی گوشے سے نمودار ہوتی اور وہ کہتا"

فرحت! فرحت!! میں آ گیا ہوں ۔ میں زندہ ہوں، میں تمھارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔قید خانے کی تنہائیوں میں تم ہر وقت میرے ساتھ تھیں ۔میرے سپنے، اور آرزوئیں سب تمھارے لیے تھیں ۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں جا چکی ہو اور میں تمام عمر تمھیں تلاش کرتا رہوں گا۔کاش قید خانے میں مجھے تمھارا کوئی پیغام مل سکتا۔۔۔!

فرحت! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے......ہم مرشد آباد سے کہیں دور نکل جائیں گے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کریں گے ۔تمھارے ساتھ رہ کر میں کبھی یہ محسوس نہیں کروں گا کہ میں کاروان حیات کا ایک لٹا ہوا مسافر ہوں ۔"

پھر اس کی کوٹھری میں اور قیدی آئے اور انھوں نے بتایا کہ فرحت اور اس کے والدین تمھاری گرفتاری کے اگلے دن مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے ۔

اس کے بعد معظم علی کو مستقبل کے متعلق موہوم امیدیں مایوسیوں سے زیادہ کرب انگیز محسوس ہوتیں تھیں ۔وہ فرحت کو ان دیکھے صحراؤں ،جنگلوں، اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔کبھی وہ اسے کسی دور افتادہ بستی کی جھونپڑی میں دیکھتا اور کبھی وہ اسے کسی پر رونق شہر کے محل میں نظر آتی تھی ۔پھر اس شہاب ثاقب کی طرح جو ایک ثانیہ کی طرح تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے ۔ فرحت کی دل کش تصویریں اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتیں اور وہ حال اور مستقبل کے بھیانک خلاء سے نکل کر ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ۔کبھی تصور اسے اس مکان میں لے جاتا جہاں اس نے زندگی کی ابتدائی مسکراہٹیں دیکھی تھیں ۔ کبھی وہ اس محلے کی گلیوں میں گھومتا جہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔سن شعور سے لے کر قید خانے میں پہنچنے تک کی زندگی اسے ایک خواب معلوم ہوتی تھی ۔۔ایک ایسا خواب جو دل کش بھی تھا اور بھیانک بھی☆

معظم علی اس قوم کا فرد تھا جو صدیوں تک اس ملک میں اپنی سطوت و اقبال کے پرچم لہرانے کے بعد زوال کے آخری مرحلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب مغلوں کی عظیم الشان سلطنت لامرکزیت اور انتشار کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان کا وہ دفاعی حصار پیوند زمین ہو چکا تھا جسے تیمور کے جانشینوں نے تعمیر کیا تھا۔ دلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے حریص قسمت آزماؤں کے لشکر موجود تھے۔ ملک کی سیاست ہر ضابطۂ اخلاق سے آزاد تھی۔ نام نہاد بادشاہ اپنے وزیروں، اہلکاروں اور بعض اوقات خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں شطرنج کے مہرے تھے۔ طالع آزماؤں کی تلواریں کبھی تاج پہننے والوں کے سر قلم کرتی تھیں اور کبھی تاج پہنانے والوں کے خون میں نہاتی تھیں۔ اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لیے ایک قسمت آزما کی لاش دوسرے قسمت آزما کے لیے زینے کا کام دیتی تھی، عہد شکنی، عیاری، فریب، سازش اور قتل لال قلعے کی دیواروں میں جنم لینے والی داستانوں کے مستقل عنوان بن چکے تھے۔ لال قلعے سے باہر صوبے دار اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں تھے۔

مرکز اور صوبوں میں محلاتی سیاست کا یہ دور الم ناک بھی تھا اور دل چسپ بھی۔ بادشاہ سلامت کبھی کسی امیر کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور کبھی اس کی خوشامد سے خوش ہو کر اسے کسی علاقے کی صوبیداری کی سند عطا فرماتے، وہ صوبائی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوتا تو اسے راستے میں یہ خبر ملتی کہ شہنشاہ والا تبار نے اپنا حکم نامہ منسوخ فرما کر کسی اور کو صوبے داری کی سند عطا کر دی ہے اور وہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت صوبائی دارالحکومت کا رخ کر رہا ہے۔

پھر صوبے کے امراء کا ایک گروہ پہلے امید کیساتھ اور ایک دوسرا گروہ دوسرے امیدوار کے ساتھ مل جاتا۔ دونوں میں جنگ ہوتی۔۔ہارنے والا امیدوار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور اس کا خون جیتنے والے کی سند پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا۔بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ صوبیداری کا ایک امیدوار شاہی فرمان کے عوض ایک معقول رقم پیش کرتا اور دوسرا امیدوار اس سے زیادہ رقم دے کر اپنے لیے ایک اور فرمان حاصل کر لیتا۔

۱۷۲۵ء میں سلطنت دہلی کے ایک ہوشیار وزیر، نظام الملک آصف جاہ نے اپنی شاطرانہ چالوں کی بدولت دکن میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔وہ بظاہر دلی کے نام نہاد بادشاہ کا صوبے دار تھا لیکن عملاً دکن کے سیاہ وسفید کا مالک بن چکا تھا۱۷۴۸ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایک دوسرے کا گلہ کاٹ رہے تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول کے اسلاف، سلطنت خوارزم پر تاتاریوں کے حملوں کے زمانہ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔اسی طرح ایک اور خاندان ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوا تھا۔اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اسی خاندان کا ایک فرد محمد جان جہاں انور الدین حکومت کا ادنیٰ ملازم تھا۔لیکن اورنگ زیب کی موت کے بعد جب ہر قسمت آزما کے لیے ترقی کے راستے کھلے تھے۔یہی جان جہاں، خان جہاں بن گیا اور کرناٹک کی نظامت پر فائز ہوا۔ ۱۷۴۹ء میں انور الدین خان جہان نے وفات پائی اور کرناٹک کی حکومت اس کے بیٹے محمد علی والا جاہ کے ہاتھ آئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر فرنگی تاجروں کی بستیاں اسلحہ خانوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ایک طویل کش مکش کے بعد انگریز اور

فرانسیسی تاجر اپنے پرتگالی اور ولندیزی حریفوں کو مات دے چکے تھے اور اب وہ ہندوستان کی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کی بجائے اس ملک کے سیاسی اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے انہوں نے ملک کے اندرونی خلف شار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کسی صوبہ میں حکومت کے لیے دو دعوے داروں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو ایک فریق انگریزوں کی حمایت حاصل کرتا اور دوسرا فریق اپنا مستقبل فرانسیسی کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

دکن میں نظام الملک آصف جاہ اول کے جان نشین کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسی کے ہاتھ میں کھیلتے رہے۔ کرناٹک میں محمد علی والا جاہ انگریزوں کی بساط سیاست کا ایک مہرہ تھا اور فرانسیسی، کرناٹک کی حکومت کے ایک اور دعوے دار چندا صاحب کے طرف دار بن گئے تھے۔ چندا صاحب نے کرناٹک کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے محمد علی کو ترچنا پلی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چند سال تک محمد علی ایک ایسا حکمران تھا۔ جس کے قبضے میں کوئی ملک نہ تھا اور جس کی رعایا زیادہ تر اپنے خاندان کے افراد، چند نوکروں، جی حضوریوں اور خوشامدیوں تک محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انگریزوں کی سنگینوں کے پہرے میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور اسے نواب والا جاہ، ! میر الہند، عمدۃ الملک، آصف الدولہ محمد علی خان، بہادر ظفر جنگ، سپہ سالار، صاحب السیف والقلم، مدبر امرائے عالم، فرزند عزیز از جان کے القابو خطابات سے پکارا جاتا تھا۔ جب انگریز فرانسیسیوں سے کرناٹک کا کوئی علاقہ فتح کرتی تو یہ سپہ سالار اپنی حرم سرا میں جشن مناتا اور جب انہیں اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو اس مدبر امراء عالم کو مفلوک الحال عوام سے ٹیکس وصول کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا

۔

پہلے چندا صاحب نے فرانسیسوں کی خدمات کے صلے میں کرناٹک کے بعض علاقے ان کے حوالے کر دیئے۔۔پھر جب محمد علی کی باری آئی تو اس نے انگریزوں کو عملاً کرناٹک کے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا۔بظاہر کرناٹک محمد علی کی شکارگاہ تھا لیکن شکار کھلنے والے انگریز تھے۔

دلی کے تخت کے ساتھ نوابان اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا ۱۸۴۱ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر علی وردی خاں نے قبضہ جمالیا۔اس زمانے میں جنوبی ہند کی طرح بنگال میں بھی انگریز تاجر اپنے قدم جما چکے تھے۔لیکن علی وردی خان ایک بیدار مغز دوراندیش حکمران تھا۔اور اس نے فرنگی تاجروں کو جو مراعات دیں ان کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنی تجارتی بستیوں میں قلعے یا دفاعی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے جو مغلیہ سلطنت کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت کی بنیاد استوار کرنے کی فکر میں تھے۔۔

معظم علی نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لٹیروں کے لیے ایک وسیع شکارگاہ بن چکا تھا۔اس کا باپ محمود علی، علی وردی خان کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔مرشد آباد کے شہر سے باہر ایک نئے محلے میں محمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیردار مرزا حسین بیگ کا قلعہ نما محل تھا۔جس کی چاردیواری کے اندر رہائشی مکان کے علاوہ گھوڑوں کے اصطبل اور نوکروں اور پہرے داروں کے کمرے تھے۔معظم علی کا باپ ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود مرزا حسین بیگ کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ابتدا میں ان کے

تعلقات محض رسمی تھے۔لیکن ان کے بیٹوں کی دوستی آہستہ آہستہ انہیں بھی قریب ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔حسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ، معظم علی دو سال بڑا تھا۔اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا، معظم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا ہم عمر تھا۔بچپن میں یوسف اور معظم محلے کے دوسرے بچوں کی طرح حویلی میں چلے جاتے اور دن بھر آصف بیگ اور افضل کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

حویلی میں ایک سنہری بالوں والی کم سن لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، اور معظم علی کو اس کے معصوم قہقہے بہت پسند تھے۔یہ لڑکی افضل کی چھوٹی بہن تھی اور اس کا نام فرحت تھا۔

محمود علی اور اس کی بیوی کو حسین بیگ کے خاندان کے مقابلے میں اپنی کم تری کا احساس تھا، تاہم انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے بچے کسی کے مقابلے میں حقیر سمجھے جائیں۔چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ ان کے بچوں کا لباس اگر حسین بیگ کے بچوں کی طرح قیمتی نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا ضرور ہو۔پھر جب آصف اور افضل مرشد آباد کے بہترین مکتب میں داخل ہوئے تو محمود علی نے یوسف اور معظم کو بھی اسی مکتب میں داخل کر دیا۔فرق صرف اتنا تھا کہ افضل اور آصف بگھی پر سوار ہو کر جاتے اور یوسف اور معظم کو پیدل جانا پڑتا تھا۔جب یہ بچے آپس میں بہت زیادہ گھل مل گئے تو آصف اور افضل اصرار کر کے معظم اور اس کے بھائی کو اپنی بگھی پر بٹھا لیتے۔گھر پر حسین بیگ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معقول تنخواہ پانے والا اتالیق مقرر تھا اور معظم اور یوسف کا باپ فرصت کے اوقات میں خود ہی انھیں پڑھا دیا کرتا تھا۔

امرا کے بچوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی ضروری خیال کی

جاتی تھی ۔ چنانچہ جب آصف اور افضل ذرا بڑے ہوئے تو حسین بیگ نے ان کی فوجی تربیت کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر کی خدمات حاصل کر لیں ۔ وہ انہیں شہسواری، تیراندازی اور نیزہ بازی سکھایا کرتا تھا۔لیکن محمود علی نے اس کام لے لیے کسی اور کی خدماتکی ضرورت محسوس نہ کی ۔ مرشد آباد میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو گھوڑے کی سواری اور تلوار نیزہ اور بندوق کے کھیلوں میں اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

اس کے گھر میں ایرانی قالین نہ تھے لیکن اس کے اصطبل میں عربی نسل کے تین چار گھوڑے ضرور موجود رہتے تھے ۔سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے وہ اپنے ذاتی اسلحہ خانے کی بہترین تلواروں اور بندوقوں پر فخر کیا کرتا تھا ۔کبھی کبھی وہ اپنی مصروف زندگی سے بچوں کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتا اور انہیں گھوڑوں پر سوار کرا کے شہر سے باہر کسی کھلے میدان میں لے جاتا۔

○

مرزا حسین بیگ کے کتب خانہ میں سینکڑوں کتابیں تھیں ۔اور یہ کتابیں اس نے پڑھنے کا شوق پورا کرنے سے زیادہ اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔ معظم کو پڑھنے کا شوق تھا ۔اور وہ کبھی کبھی افضل بیگ سے کتابیں مانگ لایا کرتا تھا ۔ایک دن وہ اس کے گھر گیا تو افضل اور آصف دیوان خانے کے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنے عمر رسیدہ اتالیق سے سبق لے رہے تھے ۔ان کی توجہ کتابوں کی طرف تھی ۔معظم علی کچھ دیر تذبذب کی حالت میں چند قدم دور کھڑا رہا ۔اچانک اتالیق نے اس کی طرف دیکھا اور کہا ۔"بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو ۔یہ کھلنے کا وقت نہیں یہ پڑھ رہے ہیں ۔بھاگ جاؤ!"

یہ بات معظم علی کے لیے متوقع تھی اور وہ چند ثانیے یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے، افضل بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے اتالیق سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ کتابیں لینے آیا ہے مجھے اجازت دیجئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

اتالیق جس قدر کھیلنے والے لڑکوں کو ناپسند کرتا تھا اسی قدر اسے پڑھنے والوں سے دلچسپی تھی۔ اس نے دوبارہ معظم علی کی طرف دیکھا اور افضل سے کہا۔ ''اچھا جاؤ لیکن جلدی آنا''!

افضل بیگ اٹھ کر معظم علی کے ساتھ چل دیا۔ دیوان خانے کے چند کمروں کے طویل برآمدے سے گزرنے کے بعد وہ کونے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کا ایک دروازہ رہائشی مکان کے صحن میں کھلتا تھا۔ کمرے میں ساگوان کی خوب صورت الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ افضل بیگ نے کہا۔ ''تم اطمینان سے اپنے لیے کتابیں نکال لو میں استاد کے پاس جاتا ہوں۔''

افضل بیگ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ معظم علی کئی بار اس کمرے میں پہلے بھی آ چکا تھا اسے اپنے مطلب کی کتابیں نکالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دو عربی اور تین فارسی کی کتابیں لے کر باہر چل دیا۔ واپسی پر وہ افضل اور آصف کے قریب سے گزرا تو اتالیق نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔ ''میاں صاحب زادے ذرا ادھر آؤ!'' معظم جھجکتا ہوا عمر رسیدہ اتالیق کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتالیق نے کہا۔ ''دکھاؤ کون سی کتابیں پڑھتے ہو تم''؟ معظم نے کتابیں آگے بڑھا دیں۔ اتالیق نے یکے بعد دیگرے تمام کتابیں کھول کر دیکھیں اور قدرے حیران ہو کر کہا۔ ''تم یہ کتابیں پڑھ سکتے ہو۔؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا ہم تمھارا امتحان لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اتالیق نے عربی کی ایک کتاب اُٹھا کر کھول لی اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ پڑھ کر سناؤ''!

معظم نے اطمینان سے چند سطریں پڑھ کر سنا دیں تو اتالیق نے ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ معظم نے کسی جھجک کے بغیر ترجمہ سنا دیا تو اتالیق نے سوال کیا۔ ''تم کہاں تعلیم پاتے ہو؟''

''جی میں افضل کے ساتھ پڑھتا ہوں۔''

''تم کہاں رہتے ہو؟''

''جی اسی محلے میں اسی مکان کے سامنے۔''

''تم.....تم محمود علی کے بیٹے ہو؟''

''جی ہاں۔''

اتالیق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''یہ کون ہے؟''

''اتالیق نے مڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ تشریف رکھیے!'' مرزا حسین بیگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ شاید محمود علی کا لڑکا ہے؟''

''جی ہاں میں ابھی اس سے متعارف ہوا ہوں بہت ہونہار بچہ ہے۔ دیکھئے یہ آپ کے کتب خانے سے صحیح فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہ کتابیں اس عمر کے بچوں کے لیے بہت مشکل ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صاحب زادوں کے ساتھ اسے بھی پڑھا دیا کروں؟''

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ غریب لڑکے محنتی ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آصف اور افضل کے لیے ایسے لڑکے کی رفاقت اچھی رہے گی۔'' یہ کہہ کر حسین

علی معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔"برخوردارتم مکتب سے چھٹی کے بعد یہاں آجایا کرو۔ میں محمود علی سے بھی کہہ دوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔"معظم علی نے تشکر کے ساتھ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

آصف نے کہا۔"ابا جان معظم کا بھائی یوسف علی میرا ہم جماعت ہے اگر آپ کی اجازت ہوتو وہ بھی یہاں آجایا کرے؟"

حسین بیگ نے جواب دیا۔"اگر تمھارے استاد کو کوئی اعتراض نہ ہوتو میری طرف سے اجازت ہے۔"

اتالیق نے کہا۔"جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اندرونی چاردیواری کے پھاٹک سے ایک نوکر نمودار ہوا اوراس نے حسین بیگ کو سلام کرنے کے بعد اتالیق کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔"جناب شیر علی خان صاحب پوچھتے ہیں کہ صاحب زادے کب فارغ ہوں گے؟"

اتالیق نے جواب دیا۔"بس میں آج کا کام ختم کر چکا ہوں، یہ جا سکتے ہیں۔ "

آصف اورافضل اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

افضل نے کہا۔"معظم آؤتم بھی، ہم آج کل پستول چلانے کی مشق کررہے ہیں۔"معظم علی جھکتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

حسین بیگ نے اتالیق سے کہا'چلیئے آج آپ بھی اپنے شاگردوں کا نشانہ دیکھئے"

○

اتالیق کانام عبدالقدوس تھا اوراس کا شمار مرشد آباد کے چند چیدہ علماء میں ہوتا

تھا وہ حسین بیگ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا محل کی اندرونی چاردیواری سے نکل کر بیرانی احاطے سے داخل ہوا تو وہاں پھاٹک سے چند قدم دور دیوار کے ساتھ ایک برآمدے میں بچوں کا فوجی استاد دکھائی دیا، وہ انہیں دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ حسین بیگ نے کہا۔ ''ہم آپ کے شاگردوں کا نشانہ دیکھنے آئے ہیں۔''

شیر علی نے کہا۔ ''یہ میری خوش قسمتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرے شاگرد آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ چلئے!''

حسین بیگ نے کہا۔ ''شیر علی یہ محمود علی کا بیٹا ہے۔ مولوی صاحب نے آج اسے زبردستی اسے اپنا شاگرد بنالیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کا امتحان لیں ۔''

شیر علی نے جواب دیا۔ ''جناب اس کا امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے باہر میدان میں گھوڑا بھگاتے اور نشانہ بازی کرتے دیکھا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ نوکروں اور پہریداروں کی کوٹھڑی کے قریب پہنچ کر رکے۔ باہر کی فصیل کے قریب ایک درخت کے نیچے چند سپاہی جمع تھے۔ اور ایک میز پر چار پستول رکھے ہوئے تھے، سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ کے ساتھ ایک تختی لٹک رہی تھی جس کے درمیاں پان کی شکل کا ایک سرخ نشان بنا ہوا تھا۔ سپاہی، حسین بیگ کو دیکھ کر ادب سے ادھر ادھر ہٹ گئے اور شیر علی کے اشارے پر آصف نے پستول چلا دیا۔ نشانہ سرخ نشان کے نچلے کنارے پر لگا۔ اس کے بعد افضل کی باری آئی اور اس کی گولی سرخ نشان سے کوئی دو انچ باہر لگی۔ تاہم اس کی عمر کے لحاظ سے یہ بھی ایک کارنامہ تھا اور بوڑھا استاد مرزا حسین بیگکی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا اب دوبارہ کوشش کرو!“ اس نے کہا۔

بچوں نے خالی پستول میز پر رکھ دیئے اور بھرے ہوئے پستول اٹھا لیے۔ افضل کی دوسری کوشش قدرے بہتر تھی لیکن آصف کا ہاتھ ہل گیا اور اس کی گولی تختی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ دو سپاہی میز کے قریب پستول بھرنے میں مصروف تھے۔ آصف نے اپنی کھسیاہٹ چھپانے کے لیے جلدی سے خالی پستول میز پر رکھا اور بھرا ہوا پستول اٹھا لیا۔ اب اس کی گولی نشانے پر لگی۔ افضل کی باری آئی تو وہ بھرا ہوا پستول اٹھا کر خود نشانہ لگانے کی بجائے معظم علی کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”اب تمھاری باری۔“

معظم نے قدرے توقف کے بعد اپنی کتابیں ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیں اور افضل کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

حسین بیگ نے کہا۔ ”میاں صاحب زادے دیکھنا کسی آدمی کو زخمی نہ کر دینا!“

افضل نے کہا۔ ”جی آپ فکر نہ کریں اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔“

معظم آگے بڑھا۔ اس نے نشان کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں لبلبی دبا دی۔۔ دیکھنے والے سرخ نشان کے عین وسط میں ایک سوراخ دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے خالی پستول میز پر رکھ دیا اور سپاہی کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حسین بیگ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئی کہا ۔”شاباش! تمھارا نشانہ بہت اچھا ہے۔“

”جی میرے بھائی کا نشانہ مجھ سے بہتر ہے۔“

حسین بیگ نے میز سے ایک پستول اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم انعام کے حق دار ہو۔ یہ لو اور دیکھو جب تم بڑے ہو کر جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر آ ؤ گے تو میں تمھیں اپنے اسلحہ خانہ کی بہترین بندوق اور اپنے اصطبل کے گھوڑے کا حقدار سمجھوں گا''۔۔

O

اس واقعہ کے تین دن بعد حسین بیگ کے ہاں مرشد آباد کے چند امراء کی دعوت تھی اور محمود علی کو پہلی بار اس کے دستر خوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک ہفتہ بعد حسین بیگ کی بیوی نے شہر کی چند معزز خواتین کو دعوت دی اور اس نے معظم علی کی ماں آمنہ کو بھی مدعو کیا۔۔ حسین بیگ کی بیوی بظاہر آمنہ کے ساتھ تپاک سے پیش آئی لیکن اونچے طبقے کی اکثر خواتین نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند نہ کیا اور اپنی میز بانی کے ظاہری خلوص کے باوجود آمنہ یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ کم سن بچوں کی دوستی اور ان کی دعوتیں اور ملاقاتیں اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتیں جوان کے درمیان حائل ہے۔ فرحت کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ امراء کی چند لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھیں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں اس کی شکل وصورت اور اس کے لباس سے متاثر تھیں اور وہ کسی کو خالہ جان سلام اور کسی کو چچی جان سلام!'' کہہ کر باری باری سب سے دعائیں لے رہی تھی۔ آمنہ کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اس کی طرف بار بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی، لیکن فرحت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ایک بار اس نے کہا۔ فرحت بیٹی تم نے اپنی خالہ کو سلام نہیں کیا اور فرحت نے بے توجہی سے آمنہ کی

طرف دیکھا اور ''خالہ جان سلام'' کہہ کر ایک امیر زادی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہوگئی ۔تاہم آمنہ کے دل سے اس کے لیے ہزاروں دعائیں نکل رہی تھیں لیکن کاش یہ شوخ اور حسین لڑکی جسے آمنہ نے پہلی ہی نظر میں ہی اپنی بیٹی سمجھ لیا تھا۔ اس کی دعائیں سن سکتی ۔کاش وہ اونچے طبقے کی دوسری خواتین کی طرح اسے اپنے پاس بیٹھا سکتی اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی ۔اس کے سنہری بالوں کو ہاتھوں سے سنوار سکتی، وہ دور ہی دور سے ان شوخ آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن میں ہمالیہ کے دامن کی جھیلوں کی دل کشی اور گہرائی نظر آتی تھی، وہ اس کے خوب صورت دانت دیکھ رہی تھی جو ہنستے وقت موتیوں کی طرح چمکتے تھے ۔دعوت کے اختتام پر وہ اپنے دل میں یہ احساس لے کر نکلی کہ حسین بیگ کی بیوی اور اس کے درمیان اجنبیت کی دیوار بدستور کھڑی ہے ۔

لیکن یہ دیوار زیادہ دیر قائم نہ رہی ۔یوسف اور معظم کے ساتھ افضل اور آصف کی بے تکلفی بڑھتی گئی ۔پہلے جب وہ مدرسے جانے کے لیے بگھی پر سوار ہو کر گھر سے نکلتے تھے تو معظم اور یوسف ڈیوڑھی کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ۔اب اگر انہیں دیر ہو جاتی تو آصف اور افضل اپنی بگھی ان کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے بلا لیتے ۔گھر میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی باتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتیں ۔''ہم آج فلاں جگہ سیر کے لیے گئے تھے''۔۔۔''آج فلاں محلے کے لڑکوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی ۔ہم صرف چار تھے اور ہم نے اتنے لڑکوں کو مار بھگایا تھا''۔۔۔''آج پیراکی میں ہمارا مقابلہ ہوا تھا اور فلاں سب سے آگے نکل گیا تھا''۔۔۔''آج فلاں نشانہ بازی اور فلاں نیزہ بازی میں اول آیا۔'' حسین بیگ کے گھر میں افضل ہمیشہ معظم علی کی اور آصف ہمیشہ یوسف کی کسی نہ کسی

خوبی کی تعریف کرتا۔اسی طرح جب معظم اور یوسفو نے سے پہلے اپنے والدین کو دن بھر کے واقعات سناتے تو معظم کی زبان پر بار بار افضل کا نام آتا اور یوسف کی زیادہ باتیں عام طور پر آصف کے متعلق ہوتیں چنانچہ ڈیڑھ ماہ کے بعد جب آمنہ دوسری بار حسین بیگ کے ہاں گئی تو افضل کی ماں اس کے ساتھ انتہائی بے تکلفی سے پیش آئی۔

وہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے بیٹوں کے بچپن کے واقعات سنا رہی تھیں اور فرحت گہری دل چسپی کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔۔۔کبھی آمنہ معظم اور یوسف کی شرارت کا ذکر تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔۔

O

وقت گزرتا گیا۔لڑکپن سے جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھتے ہی معظم علی کا بھائی یوسف اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے۔یوسف ایک سال کی ملازمت کے بعد پچاس سواروں کا افسر بن گیا۔آصف اور افضل دربار میں اپنے خاندانی اثر ورسوخ کے باعث ترقی کی منازل نسبتاً زیادہ تیز رفتار سے طے کر رہے تھے۔آصف ایک سال کی ملازمت کے بعد دوسو اور افضل سو سواروں کا افسر بن چکا تھا۔معظم علی کا باپ محمود علی اس عرصے میں ترقی کر کے محافظ فوج کے ایک ہزار سواروں کا افسر بن چکا تھا۔اس لیے یوسف کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش تھی۔ لیکن معظم علی کے مستقبل کے متعلق وہ جس قدر پر امید تھا۔اب اسی قدر پریشان ہو رہا تھا۔معظم علی نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس میں سپاہیانہ اوصاف کی کمی تھی۔محمود علی جانتا تھا کہ اس میں ایک سپاہی کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔جرأت، ہمت، عزم اور استقلال کے علاوہ ایک غیر معمولی

قوت فیصلہ اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کتابوں سے دل چسپی کے باوجود اسے سپاہیانہ زندگی پسند نہ تھی، وہ ہر روز علی الصبح سواری، نیزہ بازی اور نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ تیر کر دریا عبور کرنا اس کے لیے ایک معمولی سی بات تھی۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا اور اب تک وہ تین شیر اور پانچ چیتے مار چکا تھا۔ لیکن محمود علی جب کبھی اس کے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ چھیڑتا۔ وہ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتا۔ "ابا جان آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔" اور آمنہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی، وہ کہتی۔ "آپ معظم علی کے متعلق اس قدر پریشان کیوں ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے!"

معظم علی اپنا زیادہ وقت عبدالقدوس کے پاس گزارا کرتا تھا۔ ایک دن محمود علی نے جا کر اسے شکایت کی۔ "دیکھئے قبلہ! معظم کے مستقبل کے متعلق بڑی توقعات تھیں اور میرا خیال تھا کہ آپ کی شاگردی سے اس کی خداداد صلاحیتیں اور چمک اٹھیں گی۔ لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد مایوسی ہو رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک سپہ سالار بنیگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سوا اسے کسی چیز سے دل چسپی نہیں۔ اگر میں کسی بڑی جائداد کا مالک ہوتا تو مجھے تمام عمر اس کے گھر بیٹھنے پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں میری جائداد صرف تلوار ہے خدا کے لیے آپ اسے سمجھائیں!"

عبدالقدوس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ کو معظم علی کے متعلق مایوس نہیں ہونا چاہیے مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ ایک سلطنت کو سپاہی کی تلوار کے علاوہ عالم کے قلم کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں

سوچتے کہ معظم علی کسی شہر یا صوبے کا حاکم بننے کے لیے پیدا ہوا ہے۔آپ اسے پڑھنے کا شوق پورا کرنے دیں، مجھے اس کی خداداد صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کر سکے۔

اگر آپ نے اپنا فیصلہ اس پر تھوپنے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں مضر ہوگا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے دیں۔اگر اس نے اپنی مرضی سے سپاہی ہونے کا فیصلہ کیا تو اس میدان میں بھی عزت اور شہرت کی کوئی منزل اس سے دور نہیں ہوگی۔ ''

محمود علی نے مطمئن ہو کر کہا۔''قبلہ میں معظم سے مایوس نہیں ہوں، لیکن اس کے تمام ساتھی فوج میں شامل ہو چکے ہیں اور لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں۔''

''لوگوں کی پرواہ نہ کیجئے، جو نوجوان اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ انھیں اپنی عمر کے ایک حصے میں لوگوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔''

عبدالقدوس کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد محمود علی کی پریشانی کسی حد تک دور ہو چکی تھی اور اس کے بعد اگر اس کا کوئی دوست سوال کرتا کہ معظم علی فوج میں کیوں شامل نہیں ہوا؟ تو وہ جواب دیتا:

''معظم علی ایک عالم ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم سے بنگال کی زیادہ خدمت کر سکے گا''۔۔

○

فرحت گیارہ سال کی عمر سے پردہ کرتی تھی اور معظم نے اسے گزشتہ دو سال سے نہیں دیکھا تھا معظم کی ماں کبھی کبھی اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو اس نے معظم علی سے کہا۔''بیٹا آج فرحت تمھارے متعلق پوچھتی تھی!''

معظم علی کے گال اور کان حیا سے سرخ ہو گئے اور اس نے سوال کیا۔ ''وہ میرے متعلق کیا پوچھتی تھی؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹا وہ پوچھتی تھی کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے؟

''

معظم نے مسکرا کر کہا۔ ''امی جان مجھے افسوس ہے کہ اب آپ کو میری وجہ سے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹا اس نے مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ وہ تو اپنی طرف سے ہمدردی کر رہی تھی۔ اور اب وہ چھوٹی لڑکی نہیں۔ ماشاءاللہ اب وہ جوان معلوم ہوتی ہے، اس کی ماں اس کی پیدائش کے دن سے اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مرشد آباد کے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آتے ہیں لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور فرحت ہے بھی اس قابل کہ کسی نواب کے گھر جائے۔ مرزا صاحب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ لکھنو سے مرزا صاحب کے کسی عزیز نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگا تھا، اور حسین بیگ بھی رضامند ہو گئے تھے، لیکن فرحت کی ماں نہیں مانتی۔''

معظم جانتا تھا کہ اس کی ماں فرحت سے بہت پیار کرتی ہے اور فرحت کا ذکر آ جائے تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے ماں کو چڑانے کی نیت سے کہا۔ ''فرحت وہی لڑکی تو نہیں جس کی ناک چپٹی اور رنگ سیاہ تھا بالکل توے کی طرح۔ اور اس کی ایک آنکھ بھی ذرا چھوٹی تھی؟''

''شرم کرو۔'' ماں نے بگڑ کر کہا اور معظم اٹھ کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ دو سال پہلے کی ایک ایسی صورت کے دھندلے سے نقوش اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے

جو شوخ بھی تھی اور معصوم بھی۔

چند دن بعد ایک خوش گوار حادثہ پیش آیا۔ معظم علی صبح سویرے کوئی کتاب لینے افضل کے گھر گیا۔ وہ پہلی ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد اندرونی چار دیواری کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو آصف اور افضل فوجی لباس پہنے باہر نکل رہے تھے۔ دو نوکر صحن میں ان کے گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

معظم نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ ''بھائی یوسف کہتے ہیں کہ آج چھٹی ہے اور میں کتاب لینے آیا تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

افضل نے کہا۔ ''آج چھٹی ہے لیکن ہم چوگان کھیلنے جا رہے ہیں۔ آؤ تم کتاب لے لو!''

''لیکن جلدی آنا!'' آصف نے کہا۔ ''وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''ابھی آتا ہوں۔''

افضل معظم کو لے کر کتب خانے کے سامنے پہنچا تو باہر کے برآمدے کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔

افضل نے کہا۔ ''آج ابا باہر گئے ہوئے ہیں اور شائد نوکر نے یہ دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے، آؤ اس طرف چلتے ہیں۔''

وہ واپس مڑے اور دیوان خانے کے ایک وسیع کمرے سے گزر کر اندرونی صحن کے قریب پہنچے تو معظم کچھ سوچ کر رک گیا۔

افضل نے مڑ کر کہا۔ ''آ جاؤ گھر والے سب اوپر ہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔''

معظم علی افضل کے پیچھے صحن سے گزر کر کتب خانے میں داخل ہوا۔ افضل نے کہا۔ ''اب تم اطمینان سے کتابیں تلاش کرو مجھے دیر ہو رہی ہے میں جاتا ہوں۔''

افضل باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔معظم نے ایک الماری کھولی اور کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا دو تین الماریوں کو دیکھنے کے بعد وہ کونے کی ایک الماری کے پاس کھڑا ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ اور معاًبعد ایک دل کش نسوانی آواز سنائی دی۔"بھائی جان آپ ابھی تک۔۔۔؟"

معظم علی نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیہ کے لیے متحیر سا ہو کر رہ گیا۔ایک نوعمر لڑکی جو بے خیالی میں کمرے کے درمیان پہنچ چکی تھی اس کی نسبت کہیں زیادہ بد حواسی کے ساتھ ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہی تھی۔ معظم علی ایک نظر سے زیادہ اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔۔

معاف کیجئے میں۔۔۔؟"

معظم علی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔۔۔لڑکی فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔روشنی کی کرن کی طرح جو آئینے کو چھونے کے بعد رخ بدل لیتی ہے یا سمندر کی لہر کی طرح جو ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ لڑکی فرحت تھی۔ معظم علی نے اسے دو سال کے بعد دیکھا تھا اور وہ بھی ایک لمحہ کے لیے۔اس کے ذہن میں اس کے کوئی واضح نقوش نہ تھے۔تاہم اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اگر وہ اسے تمام عمر دیکھتا رہتا تو بھی اس کی نگاہوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔وہ اپنے دل میں ایک خوش گوار دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔لیکن یہ دھڑکن چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی۔معظم علی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں سے نہ تھا۔تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ الماری سے ایک اور کتاب نکال کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا یہ خوشگوار تصادم اس کے نزدیک محض ایک حادثہ تھا۔۔۔ماضی کا حادثہ جس

کا اس کے حال اور مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا۔۔۔وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ان کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور اگر وہ بھٹک کر تھوڑی دیر کے لیے کسی چوراہے پر ایک دوسرے سے آ ملیں تو بھی ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ فرحت مرزا حسین بیگ کی بیٹی تھی اور وہ اتنا شاعر نہ تھا کہ زمین پر کھڑا ہو کر ستاروں سے باتیں کرتا۔۔

O

کوئی آدھ گھنٹے کی تلاش کے بعد معظم ایک کتاب لے کر باہر نکلا تو برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر اسے حسین بیگ دکھائی دیا۔ معظم نے بڑھ اسے سلام کیا اور حسین بیگ نے وعلیکم اسلام"

کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معظم علی نے کہا۔ "میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔"

برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حسین بیگ نے ایک کرسی پر بیٹھتے پر کرسی ہوئے کہا۔

"معظم بیٹھ جاؤ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "برخودار تمھارے متعلق مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ کتابوں سے دل چسپی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے فرائض سے آنکھیں بند کر لو۔ ابھی شاہی محل کی باہر تمھارے ابا جان ملے تھے۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک سپاہی بن کر اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔ شیر علی تمھارے متعلق کہا کرتا تھا کہ تم کسی دن سپہ سالار بنو گے۔ لیکن تم کتابوں کے شوق میں خداداد صلاحیتیں

ضائع کر رہے ہو۔ آخر تم فوج میں شامل ہونے سے کیوں ڈرتے ہو؟ جسمانی لحاظ سے تم بنگال کے ہزاروں نوجوانوں کے لیے قابل رشک ہو۔ نیزہ بازی، شہسواری اور نشانہ بازی میں بہت کم نوجوان تمھارا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمھیں خدا نے ذہانت بھی دی ہے اگر تم اپنے بھائی کی طرح دو سال قبل فوج میں شامل ہو گئے ہوتے تو اب تک شاید دو سو سوار تمھاری کمان میں ہوتے، لیکن اگر تمھیں ایک معمولی افسر کی حیثیت سے فوج میں شامل ہونا پسند نہیں تو میں تمھاری سفارش کر سکتا ہوں۔ علی وردی خان کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ میر مدن میرا دوست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمھیں اس کے پاس لے چلتا ہوں۔"

معظم علی نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ "چچا جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ابتدا نہیں کرنا چاہتا میں جس فوج کا ادنیٰ سپاہی بننا پسند نہیں کرتا اس کا سپہ سالار بننا بھی پسند نہیں کروں گا جس دن مجھے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ میں ایک سپاہی بن کر قوم اور وطن کی کوئی خدمت سر انجام دے سکتا ہوں۔ اس دن میرے سامنے یہ سوال نہیں ہو گا کہ میں ایک سپاہی ہوں یا سپہ سالار۔ میرے سامنے صرف یہ سوال ہو گا کہ میں نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے وہ کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔ اپنے ضمیر کا اطمینان میرے لیے سب سے بڑا انعام ہو گا۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "اور وہ دن کب آئے گا جب تم قوم اور وطن کے لیے تلوار اٹھانے کی ضرورت محسوس کرو گے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "جب ہماری باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو گی جو اجتماعی حیات کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ہماری

سب سے بڑی بیماری لامرکزیت ہے اور اس لامرکزیت کا باعث ان بے شمار طالع آزماؤں کی ہوسِ اقتدار ہے۔ جو ہندوستان کو اپنی چھوٹی چھوٹی شکارگاہوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک سپاہی کی تلوار چند امراء کی مسندوں کی حفاظت کر کے ان کے اقتدار کی مدت میں چند مہینوں یا چند برسوں کا اضافہ کر سکتی ہے لیکن قوم کی اجتماعی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔"

حسین بیگ اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔ "ہماری گفتگو بنگال کی فوج کے متعلق تھی جو ایک طرف مرہٹوں کی لوٹ مار اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم کے خلاف ہمارا واحد سہارا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "جی ہاں! لیکن بدقسمتی سے علی وردی خان کی فوج کے سپاہیوں اور جرنیلوں کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگال کے دوست کون ہیں اور دشمن کون؟"

حسین بیگ طرتاً حکومت پسند تھا اور علی وردی خان سے اسے غایت درجہ کی عقیدت تھی۔ وہ بنگال کے حکمران کی ذات کو تنقید یا تبصرے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کے ساتھ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "برخوردار مجھے امید ہی کہ علی وردی خان کے متعلق بات کرتے وقت تم سنجیدگی کا ثبوت دو گے اور اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ وہ ہمارا حکمران ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "چچا جان معاف کیجئے، میں نے علی وردی خان کی ذات کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا، بے شک وہ ہمارا حکمران ہے لیکن اگر کوئی حکومت اپنے خلاف نکتہ چینی کا حق مجھے نہیں دیتی تو وہ مجھ سے اپنی حفاضت کے لیے تلوار اٹھانے کا مطالبہ ہی نہیں کر سکتی۔ مجھے علی وردی خان کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف

ہے۔ ملک کے کئی دوسرے حکمرانوں سے وہ یقیناً بہتر ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس سلطنت کی مرکزی قوت نہ ہونے کے برابر ہو وہ زیادہ دیر کسی قوم کی آزاد اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ دہلی میں مسلمانوں کی سطوت پر چم سرنگوں ہو چکے ہیں اور عالم گیرؒ کی عظیم سلطنت کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے گھروندے تعمیر کرنے والے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی جدو جہد کسی اجتماعی نصب العین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہے۔ مسلمان صدیوں کی حکومت کے بعد من حیث القوم اب بتدریج اس تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جو انتشار اور لامرکزیت میں مبتلا ہونے والی اقوام کی آخری سزا ہوتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "عالمگیرؒ کے جان نشین نا اہل ہیں اور اب اگر تم دہلی کے دربار کی حالت دیکھو تو علی وردی خاں، جیسے لوگوں کا دم غنیمت سمجھو گے۔ اگر ایسے لوگ دہلی کے نا اہل اور مفلوج حکمرانوں سے مایوس ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے تو اب تک سارا ملک دشمنوں کے قبضے میں چلا جاتا، آج مرشد آباد، لکھنو اور حیدر آباد کے حالات یقیناً دہلی کے حالات سے زیادہ بہتر ہیں۔"

"آپ درست کہتے ہیں لیکن آپ آج کی بنائے کل کے متعلق سوچیں۔ درخت سے کٹی ہوئی شاخیں زیادہ دیر سبز نہیں رہتیں۔ میں اورنگزیب عالم گیرؒ کے نا اہل جان نشینوں سے کہیں زیادہ ان قسمت آزماؤں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جن میں کسی اچھے حکمران کو مسند حکومت پر بٹھانے کی جرأت و ہمت نہ تھی۔۔۔ دلی کے نا اہل، مفلوج اور بے بس حکمران ان کی گروہی سیاست کی پیداوار تھے لال قلعہ ان کے لیے زور آزمائی کا اکھاڑہ تھا۔ بادشاہوں کے تاج ان کے ہاتھوں

کے کھلونے تھے۔ ہر گروہ کی یہ خواہش تھی کہ حکمران کی حیثیت ایک بے بس دعا گو سے زیادہ نہ ہو۔اور وہ اس کی سرپرستی میں زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ایک گروہ کسی نا اہل حکمران کو اپنی بساط سیاست کا مہرہ سمجھ کر تخت پر بٹھاتا اور دوسرا گروہ اسے تخت سے اتار کر اس سے زیادہ نا اہل امیدوار کے سر پر تاج رکھنے کی جدوجہد کر دیتا تھا۔اگر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر دہلی سے باہر چند صوبہ داروں نے اپنے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج رکھ لیے ہیں تو ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔

اگر دہلی کے امرا نیک نیت ہوتے اور ان کی سیاست قوم کے اجتماعی مفاد کے تابع ہوتی تو وہ یقیناً اپنی ذاتی سودا بازیوں کی خاطر نا اہل حکمران تلاش کرتے۔ انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ چند فاتر العقل حکمرانوں کو تخت پر بٹھانے کی جدوجہد کی تھی۔اگر اسی مستعدی کے ساتھ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول یا کسی اصول یا ضابطۂ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشوں اور امنگوں کی شکست سمجھتے تھے۔ وہ کسی اصول یا مقصد کے لیے قربانی دینے کی بجائے ہر اصول اور مقصد کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کرنا سیکھ چکے تھے۔دہلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکمران برے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے ضمیر امراء جو سلطنت کے ستون کہلاتے تھے ہر برائی میں اپنی بھلائی تلاش کرتے تھے۔"

حسین بیگ کیلیے معظم علی کی گفتگو کا صرف وہ حصہ قابل توجہ تھا جو بنگال اور علی وردی خاں کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔دہلی کے امراء سے اسے کوئی دل چسپی نہ تھی اور معظم علی اگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا تو بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔اس نے کہا۔"برخوردار مجھے دہلی کے امراء سے کوئی دل چسپی نہیں۔اگر انہوں نے برائی کا بیج بویا تھا تو انہیں کئی بار اس کی سزا مل چکی۔دہلی کئی بار

مرہٹوں اور جاٹوں کے ہاتھ لٹ چکی ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے ایسے حالات میں بھی بنگال، اودھ، اور دکن کو تباہی سے بچالیا ہے۔خدا کرے اس کا سایہ چند برس اور ہمارے سر پر رہے اور تم جیسے نوجوان بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔''

حسین بیگ ان الفاظ پر اس ناخوش گوار بحث کو جو کہ اس کے لیے کافی حد تک ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔لیکن معظم علی نے کہا:

چچا جان آپ برا نہ مانیں ۔ مستقبل کے مورخ ان صوبہ داروں کو موجودہ صورت حالات کی خرابی سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جنھوں نے دہلی کے دربار کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کو آپس میں تقسیم کرلیا ہے ۔اگر ان میں سے کوئی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیتا اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ قوم کو تباہی سے بچایا جائے تو کم از کم میں اس سے اس کا حسب ونسب نہ پوچھتا۔اگر وہ اپنے کردار سے قوم کا نجات دہندہ ثابت ہوتا تو میں ایک رضا کار کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا۔اس کی فوج کا معمولی سپاہی بن کر مجھے یہ اعتماد ہوتا کہ جب وہ کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو میں اسے روک سکوں گا۔اس کی امنگیں میری امنگیں ہوتیں، اس کے دل کی دھڑکنیں، میرے دل کی دھڑکنیں اور اس کے ضمیر کی آواز میرے ضمیر کی آواز ہوتی ۔اور اس کی شکست کو میں اپنی شکست سمجھتا۔پھر ایسے شخص کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طالع آزماؤں کے کسی گروہ کی حمایت کی ضرورت پیش نہ آتی ۔وہ ایک مقصد کے لیے ایثار اور قربانی کا ولولہ لے کر میدان میں نکلتا اور عوام کی اجتماعی قوت اس کے ساتھ ہوتی ۔وہ عوام کے لیے جھونپڑے تعمیر کرتا اور اس کے اقتدار کی مسند مرمریں ایوانوں کی بجائے ان

کے دلوں میں ہوتی ۔لیکن یہ لوگ جنھیں آپ قوم کا نجات دہندہ خیال کرتے ہیں۔ مجھے کسی ایسے اجتماعی اصول کے علم بردار نظر نہیں آتے جس کی فتح کو قوم کی فتح سمجھ سکوں۔ یہ لوگ ہمارے احساس اور شعور کی بجائے ہماری بے حسی کی پیداوار ہیں۔ ان کی مثال اس درخت کی ہی جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر پھیلی ہوتی ہیں اور جسے گرنے کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مرہٹوں کی لوٹ مار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری سے بچانا چاہتے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ ایک دن مرہٹوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور دوسرے دن ان کے دوست بن جاتے ہیں اور اگر مرہٹے انھیں مدد دینے لے لیے تیار ہو جائیں تو وہ اپنے مسلمان ہمسایہ پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ انگریز ہماری آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ لیکن ان میں سے کون ہے جس نے اپنی کسی نہ کسی ذاتی مصلحت کے پیش نظر انگریزوں کو اس ملک میں پاؤں جمانے کے لیے مدد دی؟ ان کا منتہائے نظر صرف ذاتی اقتدار ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ لوگ کسی دن قوم کی بقا کو بھی داؤں پر لگا دیں گے“

حسین بیگ کے تیور دیکھ کر معظم چند ثانیے خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔” چچا جان میں نے یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ علی وردی خاں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات سے آپ میری نسبت کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جس چیز کو خطرناک سمجھتا ہوں وہ ان کی مصلحتیں ہیں۔۔ ایک ایسے حکمران کی مصلحتیں جس کا اقتدار کسی مقصد کے لیے جدوجہد کا ثمر نہیں بلکہ اپنی

ذاتی ذہانت اور حکمت کا نتیجہ ہے، جو لوگ کسی مقصد کے لیے جد و جہد کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی پونجی وہ تربیت یافتہ رائے عام ہوتی ہے جسے وہ اپنا نصب العین کے حصول کے لیے بیدار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اقتدار اگر لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو تو عوام کا اجتمائی شعور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو تو رائے عامہ ان کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے ایسے لوگوں کو اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے قسمت آزما قسم کے لوگوں سے جوڑ توڑ یا سودے بازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔۔ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ساری قوم اپنے دوست سمجھتی ہے۔ ان کے دشمن سب کی نگاہوں میں دشمن ہوتے ہیں۔لیکن بدقسمتی سے اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود علی وردی خاں کا شمار ایسے لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔انہوں نے صرف اپنی ذاتی قابلیت یا ہوشیاری کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی، اور اس حکومت کے تحفظ کے لیے بھی وہ چند ہوشیار آدمیوں کی حمایت یا دوستی کافی سمجھتے ہیں ۔ بنگال کو جب کوئی اندرونی خطری پیش آتا ہے تو وہ انگریزوں یا مرہٹوں کی معاندانہ سرگرمیوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اگر کوئی بیرونی خطرہ در پیش ہو تو وہ اپنے بدترین غداروں کو بھی معاف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بے شک وہ ایک ہوشیار سیاست دان اور تجربہ کار جرنیل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بنگال کے سپاہی کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصل محاذ کہاں ہے۔"

حسین بیگ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا:

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ علی وردی خاں انتہائی نا قابل اعتماد آدمی ہے جو

حسب ضرورت اپنے دوست اور دشمن بدلتا رہتا ہے؟''

معظم علی نے جواب دیا۔''میں نے علی وردی خاں کو نا قابل اعتماد نہیں کہا لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے گرد ایسے آدمی جمع ہیں۔ جنھیں میں قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور اگر ان کے سامنے ایک حکمران کی ذاتی مصلحتیں نہ ہوتیں تو ان کے دربار میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔''

حسین بیگ نے کہا۔''اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ علی وردی خاں کے سپاہیوں کو یہ علم نہیں کہ ان کا محاذ کہاں ہے؟''

''جی ہاں اور میں غلط نہیں کہتا!''

''شاید علی وردی خاں کو بھی یہ علم نہ ہو کہ ان کا محاذ کہاں ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم مجھے بتا دو اور میں اس کے کانوں تک تمھاری یہ آواز پہنچا دوں؟''

معظم علی نے حسین بیگ کی طنز سے بھری ہوئی مسکراہٹ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اس نے جواب دیا۔''جی انھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میر جعفر جیسے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہوسکتے۔''

حسین بیگ کو میر جعفر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی تاہم وہ علی وردی خاں کی فوج کے ایک افسر کی زبان سے اس کے خلاف کچھ سننے کے لیا تیار نہ تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔''دیکھو برخوردار اگر تم فرج میں شامل ہونا نہیں چاہتے تو میں تمھیں مجبور نہیں کرسکتا لیکن علی وردی خاں کے ساتھیوں کے متعلق زبان کھولتے وقت تمھیں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ سلطنت کے ستون ہیں اور تمھارا والد فوج کا ملازم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمھارے خیالات اس قدر باغیانہ ہیں میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر تمھاری باتیں سنی ہیں لیکن اس مکان کی چار دیواری سے باہر اگر تم نے

کسی سے اس قسم کی باتیں کیں تو تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔تم افضل اور آصف کے دوست ہو اور میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم ان کے سامنے ایسے خیالات کی تبلیغ کرو۔تم ابھی بچے ہو۔لیکن وقت آنے پر تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ علی وردی خاں بنگال کے مسلمانوں کا آخری سہارا ہے۔"

معظم علی نے کرسی اٹھا کر کہا۔"چچا جان اگر میں نے کوئی تلخ بات کہہ دی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔لیکن آپ یقین رکھیں وقت آنے پر میں ثابت کرسکوں گا کہ بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل مجھے کسی سے کم عزیز نہیں"

○

اگلے روز معظم اور یوسف،اپنے باپ کے ساتھ عشاء کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ حسین بیگ کے نوکر نے پیچھے سے آواز دی۔وہ رک گئے اور نوکر نے قریب آ کر محمود علی سے کہا۔"مرزا صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

محمود علی نے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔"تم جاؤ میں ان سے مل کر آتا ہوں ۔"

محمود علی نوکر کے ساتھ چلا گیا تو یوسف نے معظم علی سے کہا۔"معظم مرزا صاحب نے ابا جان کو اس وقت بلایا ہے۔خیر تو ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔"بھائی جان معلوم ہوتا ہے آج میری شامت آئے گی۔"

i

کیوں کیا ہوا؟"

"کل میری باتوں سے مرزا صاحب خفا ہو گئے تھے۔"

''کیوں تم نے ان سے کیا کہا تھا؟''

وہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کے متعلق پریشان ہو رہے تھے۔اور میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''اور اب وہ پریشان ہوں گے۔تم نے علی وردی خاں کے متعلق ضرور کوئی ایسی ویسی بات کہی ہوگی؟''

''میں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا تھا اور انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں علی وردی خاں کی حکومت کا باغی ہوں۔''

''تمھیں مرزا صاحب کے ساتھ نہیں الجھنا چاہیے۔وہ پرانی وضع کے آدمی ہیں، اور علی وردی خاں کے ساتھ ان کے مراسم بہت گہرے ہیں۔''

یوسف اور معظم نے نماز کے بعد کچھ دیر محمود علی کا انتظار کیا اور پھر گھر کی طرف چل دیئے۔گھر پہنچ کر وہ صحن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر بعد محمود علی بھی آ گیا اور اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کہا۔''معظم تم نے کل مرزا صاحب سے کیا باتیں کی تھیں؟''

ابا جان میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ خوف یا کاہلی ہے۔مرزا صاحب بہت زیادہ خفا تو نہیں تھے؟''

''نہیں بلکہ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ تمھارے ساتھ سختی سے پیش آئے تاہم وہ تاکید کرتے تھے کہ تمھیں علی وردی خاں اور ان کے امراء کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے'

معظم علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔''ابا جان انہوں نے یہ تو ضرور کہا ہو گا کہ میں بہت نالائق ہوں؟''

"نہیں، وہ یہ کہتے تھے کہ تمھارا بیٹا میرے لیے ایک معما ہے، کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایک سادہ دل نوجوان ہے اور کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسے نوجوان یا تو دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں اور یا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "ابا جان میں بھائی جان سے ابھی کہہ رہا تھا کہ وہ میری شکایت کریں گے اور آپ گھر آ کر میری خوب مرمت کریں گے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ آئندہ مجھے اپنے گھر کی چار دیواری کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔"

"تم نے ان سے میر جعفر کے خلاف کچھ کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"وہ ہر اس آدمی کو اچھا سمجھتے ہیں جو میر جعفر کا برا خیال کرتا ہے۔"

"لیکن انہوں نے تو مجھے ڈانٹ دیا تھا۔"

"یہ ان کی ظاہر داری تھی۔ لیکن تمھیں ایسے خیالات کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہیں۔"

"ابا جان میں محتاط رہوں گا۔"

"مرزا صاحب ایک اور بات کہتے تھے۔"

"وہ کیا؟"

وہ کہتے تھے کہ معظم علی کے لیے میرے کتب خانے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا۔ لیکن مجھے اس دن خوشی ہوگی جب وہ میرے اسلحہ خانے سے تلوار اور میرے

اصطبل سے گھوڑے لینے آئے گا‘‘

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

دوسرا باب

ایک دن مرشدآباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں راگھو جی بھونسلہ کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج بردوان کی طرف بڑھ رہی ہے۔علی وردی خاں مرشد آباد سے باہر شکار کھیل رہا تھا۔اس نے مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی بردوان کا رخ کیا اور مرشدآباد اور دوسرے شہروں کی افواج کو یہ حکم بھیجا کہ وہ راستے میں اس کے ساتھ آملیں ۔دو دن کے اندر اندر مرشدآباد کی چھاؤنی خالی ہو گئی اور سپاہیوں کے صرف چند دستے شہر اور شاہی محل کی حفاظت کے لیے رہ گئے ۔ چند دن بعد یہ خبر کہ علی وردی خاں کا ایک دار میر حبیب اور فوج کے چند افسر بنگال سے غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور پنڈت بھاسکر نے یہ اعلان کیا ہے کہ بنگال کی فوج غداری کرنے والوں کو مرہٹہ فرج میں اپنے سابقہ عہدوں پر لے لیا جائے گا۔مرشدآباد میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی ۔

محمود علی، یوسف علی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف بیگ اور افضل مرشدآباد کی فوج کے ساتھ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکے تھے ۔

معظم علی کو پہلی بار نہایت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس کہ محلے کے وہ لوگ جن کے بیٹے جنگ کے لیے جا چکے ہیں ۔اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔

شاہی محل کا داروغہ معظم علی کے باپ کا دوست تھا اور وہ ہر روز علی الصباح اس کے پاس جنگ کے تازہ حالات معلوم کرنے کے لیے جایا کرتا تھا ۔ایک دن وہ داروغہ سے مل کر واپس آیا تو اسے اپنی ماں کا چہرہ بے حد مغموم دکھائی دیا ۔

”کیا ہوا امی جان؟“ اس نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔! کوئی اچھی خبر آئی ہے؟"

"ہاں امی جان آج کی خبریں اچھی ہیں۔ مرہٹے چند جھڑپوں کے بعد پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن ابھی کوئی فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوا ہے۔ آپ اس قدر غمگین کیوں ہیں؟"

"بیٹا!" ماں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے فرحت سے یہ توقع نہ تھی۔
"

"کیا ہوا امی جان؟" معظم علی نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ "فرحت نے کیا کہا؟"

"اس میں فرحت کا قصور نہیں بیٹا۔ اصل میں وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئیں تھیں بہت بدتمیز تھیں۔"

"فرحت یہاں آئی تھی؟"

"ہاں وہ ابھی گئی ہے۔"

"آ کر کیا کیا اس نے؟"

ماں نے اٹھ کر ایک الماری سے کانچ کی چند چوڑیاں نکالیں اور معظم علی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو! فرحت آج اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی تھی اس کے ساتھ سلطان خاں کی لڑکی بھی تھی۔ مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ لیکن آج اس نے بہت زیادتی کی۔ پہلے اس نے کہا کہ تم بزدلی کی وجہ سے فوج میں داخل نہیں ہوئے، پھر اس نے اپنی چوڑیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں اور کہنے لگی معظم بھائی کو ہماری طرف سے تحفہ دے دیجیے۔"

تھوڑی دیر کے لیے معظم علی کی رگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آ گیا

اس نے کہا۔ ’’اور فرحت نے کیا کہا؟‘‘

’’فرحت نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں کا منہ بند کرے گی لیکن وہ خاموشی سے ہنستی رہی۔‘‘

’’امی جان اگر آپ کو ایسی باتوں سے صدمہ ہوا ہے تو میں اکیلا مرہٹوں کے لشکر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیئے۔ وقت آنے پر کوئی آپ کے بیٹے کو بزدل نہیں کہے گا اور وہ سلطان خاں جس کی صاحب زادی نے آپ کو میرے لیے چوڑیاں دی ہیں۔ خود مرہٹوں کے حملہ کی خبر سنتے ہی شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا تھا۔ امی جان میں فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا کہ موجودہ حالات میں میرا مرشد آباد میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شہر سپاہوں سے قریباً خالی ہو چکا ہے۔ اگر دشمن نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر چند تیز رفتار دستے اس طرف بھیج دیئے تو یہ محلّہ تو درکنار شاہی محل بھی محفوظ نہیں رہے گا اور شہر سے باہر یہ ہمارا محلّہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں مرزا صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔‘‘

’’لیکن بیٹا خدا کے لیے فرحت کی شکایت نہ کرنا۔ اس کی نیت بری نہ تھی۔‘‘

معظم علی نے کہا۔ ’’نہیں امی جان میں آصف اور افضل کی بہن کی شکایت نہیں کر سکتا لیکن چوڑیاں سنبھال کر رکھیے۔

○

معظم علی، حسین بیگ کے محل میں داخل ہوا تو وہ بیرونی احاطے میں بندوق سے نشانہ بازی کر رہا تھا اور آٹھ دس سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب حسین بیگ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا۔۔

"چچا جان آج میں کتب خانہ کی بجائے آپ کے اسلحہ خانہ دیکھنے آیا ہوں۔"

حسین بیگ مسکرایا۔ "تمھیں تلوار کی ضرورت ہے یا بندوق کی؟"

"ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کے کتب خانے میں ڈیڑھ ہزار کتابیں ہیں ۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیا سلحہ خانہ میں کتنا سامان ہے؟"

"اگر استعمال کرنے والے ہوں تو سامان بہت ہے ۔لیکن میں تمھاری اس اچانک دل چسپی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "شہر فوج سے خالی ہو چکا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن نے ہوشیاری سے کام لیا تو مرشد آباد پر اچانک قبضہ کر لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا اور یہ محلّہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو آپ کا مکان اس محلے کے لیے قلعے کا کام دے سکتا ہے۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس قلعے کا محافظ مقرر کر دیا جائے۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "لیکن میرے پاس صرف پندرہ تربیت یافتہ سپاہی اور پانچ چھ نوکر رہ گئے ہیں ۔اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو تم اتنے آدمیوں کے ساتھ کیا کرسکو گے؟"

"آدمیوں کی فکر نہ کیجئے۔ خطرے کے وقت محلے کا ہر آدمی یہاں پہنچ جائے گا ۔میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انھیں تربیت دینے کا موقع مل جائے۔ انھیں اسلحہ اور بارود کی ضرورت ہوگی اور یہ فراہم کرنا آپ کا کام ہوگا۔"

"برخوردار تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا۔ میرے پاس کوئی اڑھائی سو بندوقیں ہیں اور قریباً اتنے ہی پستول اور تلواریں ہیں۔ بارود اتنا ہے کہ اگر استعمال کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہفتے میں بھی ختم نہیں ہوگا۔ دو توپیں جو میں نے پانچ

سال قبل خریدی تھیں اندر پڑی ہوئی ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ انھیں کہاں نصب کیا جائے۔ اب اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ فیصلہ اس قلعہ کا محافظ کرے گا۔''

''تو آپ کو میری خدمات منظور ہیں؟''

حسین بیگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''معظم علی میں تمھیں اپنے قلعے کا محافظ اور اپنی ان افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں جن کی تعداد سر دست پندرہ تربیت یافتہ اور چھ غیر تربیت یافتہ سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔''

معظم علی نے کہا۔ ''آپ کا سپہ سالار آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔''

حسین بیگ نے معظم کی گردن ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا میں تم سے کبھی مایوس نہ تھا۔''

معظم علی نے کہا۔ ''ہمیں آج ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ آج شام آپ محلے کے بااثر لوگوں کو یہاں جمع ہونے کی دعوت دیں!''

''بہت اچھا، لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اچانک یہ خیال کیسے آیا مرشد آباد کو واقعی کوئی خطرہ ہے؟''

''چچا جان اگر خطرہ نہ بھی ہو تو بھی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ ابھی آپ نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ آپ ہنگامی حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہیں۔''

حسین بیگ نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کہ محاذ پر اپنے سپاہی بھیج دینے کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر کوئی سر پھرا اس طرف آ نکلے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہمارے گھر میں فرحت ایسی باتیں سوچا کرتی ہے۔

جس دن سے آصف اور افضل گئے ہیں۔وہ صبح شام باقاعدہ نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی ہے۔ایک دن اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔احتیاط کرنا اچھی بات ہے تاہم میں یہ نہیں سمجھتا کہ مرہٹے محاذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلیں گے۔لیکن تم اس مسئلے میں بہت سنجیدہ ہو اور تمھاری باتوں سے تو مجھی محسوس ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا لشکر واقعی مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔''

معظم علی نے کہا۔''چچا جان میرے خدشات بلاوجہ نہیں۔مرہٹے فتح کی بجائے لوٹ مار کے لیے آئے ہیں۔اب تک انھوں نے اپنے راستے کی بستیوں اور شہروں کو برباد کیا ہے لیکن بہت کم مقامات ایسے ہیں جن پر انھوں نے قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوسکتے کہ بنگال کی زیادہ دولت مرشد آباد میں ہے اور ہمارے غدار جوان کے ساتھ جا ملے ہیں۔انھیں یہ بھی بتا چکے ہوں گے کہ مرشد آباد پر حملہ کرنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ محاذ جنگ سے ہماری فوج کی توجہ ہٹانے کے لیے چند دستے اس طرف بھیج سکتے ہیں۔ آپ میر حبیب کو جانتے ہیں وہ ایک ہوشیار آدمی ہے۔اور مرشد آباد کے چپہ چپہ سے واقف ہے۔اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک مرشد آباد پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جگت سیٹھ نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ سو آدمی بھرتی کیے ہیں اور ہمارے استاد شیر علی کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔آج صبح جب میں محاذ جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کے داروغہ کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں شیر علی خاں ملے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی جگت سیٹھ کی ملازمت کر لوں۔ لیکن میں نے جواب دیا کہ میں ایک کروڑ پتی مہاجن کے خزانوں کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنے محلے کے کسی غریب آدمی کے دروازے پر پہرہ دینا بہتر سمجھتا ہوں

چچا جان ہوسکتا ہے کہ میرے خدشات محض وہم ثابت ہوں۔لیکن جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی اور ہماری فوج واپس نہیں آتی میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔اب اگر اجازت ہوتو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کی دفاعی حالت کیسی ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''بہت اچھا تم اپنا کام کرو، میں محلے کے آدمیوں کو دعوت بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر حسین بیگ اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہوا۔۔۔تم سب اچھی طرح سن لو کہ آج سے معظم علی تمھارا حاکم ہوگا اور اسے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے''

○

شام کے وقت حسین بیگ کے دستر خوان پر محلے کے تیس چیدہ چیدہ آدمی جمع تھے، پہلے حسین بیگ نے انھیں جمع کرنے کی غرض و غایت بیان کی اور اس کے بعد معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔مہمانوں کی اکثریت یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔وہ محض احتیاط کے طور پر اپنے اپنے زیر اثر لوگوں کو منظم کرنے کے لیے تیار تھے صرف دس آدمی ایسے تھے جنھیں حسین بیگ اور معظم علی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق تھا اور جنھوں نے ان کے ساتھ صدق دل سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اگلے دن صرف بیس نوعمر لڑکے اور تیس بڑی عمر کے آدمی جن میں سے اکثر محلے کے غریب دکان دار، مزدور اور چند امیر گھرانوں کے نوکر تھے۔حسین بیگ کے مکان پر حاضر ہوئے حسین بیگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن معظم علی کے نزدیک یہ ابتداء بری نہ تھی۔اس نے اسلحہ خانے سے بندوقیں نکال کر ان میں تقسیم کیں اور انھیں محلے سے باہر ایک کھلے میدان میں نشانہ بازی کے لیے لے گیا۔دوسرے دن

پندرہ اور آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ایک ہفتے کے بعد معظم علی سے فوجی تربیت حاصل کرنے والے رضا کاروں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔

اس کے بعد دونوکر صابر اور جمال خاں بھی رضا کاروں میں شامل ہو چکے تھے ۔جمال خاں چند برس بنگال کی فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔لیکن صابر کوتلوار اور بندوق سے کوئی دل چسپی نہ تھی وہ صرف جمال خاں کی رقابت کی وجہ سے رضا کاروں کی پریڈ میں شامل ہوتا تھا،تین دن اپنے ساتھیوں کے قہقہے سننے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کا پہلا نشانہ ہدف پر لگا اور وہ بندوق وہیں پھینک کر بھاگتا ہوا معظم کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں چلایا:

''سرکار میرا نشانہ ٹھیک ہو گیا ہے اب مجھے چھٹی دے دیجئے، گھر میں بہت کام ہے۔''

معظم علی کی یہ مہم اب آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی ۔کچھ لوگ اپنی مرضی سے اور کچھ مجبوراُس کا ساتھ دے رہے تھے۔وہ ہر روز تین چار گھنٹے رضا کاروں کوتربیت دینے کے بعد حسین بیگ کے محل چلا جاتا ۔جہاں حسین بیگ نے اس کی ہدایات کے مطابق چالیس مزدور پرانی دیواریں مرمت کرنے اور مختلف مقامات پر مورچے بنانے کے کام پر لگا رکھے تھے۔معظم علی ان کا کام دیکھتا۔محل کے مختلف گوشوں میں چکر لگاتا اور اگر کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو انھیں ہدایت دے کر چلا آتا ۔پھر وہ محلے کی گلیوں میں پھرتا اور خاص خاص مقامات پر مورچے تعمیر کروانے کا مشورہ دیتا۔چند دنوں بعد محلے گلی پر پھاٹک لگ چکے تھے۔آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس کام میں دل چسپی لینے لگے جو چند دن پہلے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔عشاء کی نماز کے بعد قریباً ہر روز

اس کے چند چیدہ چیدہ ساتھی حسین بیگ کے مکان پر جمع ہو کر کارگزاری کا جائزہ لیتے اور اگلے دن کے لیے پروگرام بناتے:۔

ایک دن مرزا حسین بیگ کی دعوت پر شیر علی نے اس کی حویلی کے دفاعی انتظامات کا معائینہ کیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلوں پر اینٹوں کے ستون تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کے استفسار پر معظم علی نے بتایا کہ فصیل زیادہ چوڑی نہیں۔ جب ان ستونوں پر لکڑی کے تختے ڈال دئے جائیں گے تو سپاہیوں کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ فصیل کا کنارہ ذرا اونچا ہوگا اور یہ سپاہیوں کے لیے ڈھال کا کام دے گا، باقی تین طرف یہ کام ختم ہو چکا ہے۔ چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔"

شیر علی نے بیرونی احاطے میں فصیل کا چکر لگانے کے بعد حسین بیگ سے کہا۔

"مرزا صاحب آپ نے تو اس مکان کو قلعہ بنا دیا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "ڈیوڑھی کی چھت پر بھی ہمارا مورچہ کافی مضبوط ہے، لیکن یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو میں مرزا صاحب کو یہ چاردیواری گرا کر نئی فصیل تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چلیے آپ کو اندرونی حصہ دکھاتا ہوں!"

شیر علی ان کے ساتھ اندرونی احاطے میں داخل ہوا معظم علی نیا سے رہائشی مکان کی نچلی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ریت کی بوریوں کے مورچے دکھانے کے بعد کہا۔ "آپ اسی قسم کے انتظامات بالائی منزل میں بھی دیکھیں گے۔ میں نے چھتوں پر بھی مورچے بنوا دیے ہیں اگر دشمن اندرونی احاطے تک پہنچ گیا تو اسے ہر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ چھتوں اور

برآمدوں کے مورچوں سے گولیوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔تاہم میں ان انتظامات کو کافی نہیں سمجھتا۔ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔اندرونی احاطے کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔اوران کی بلندی بھی زیادہ نہیں۔۔دشمن بیرونی احاطے میں داخل ہونے کے بعد انھیں آسانی سے پھاند کر اندر آسکتے ہیں ان کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ انھیں اونچا بھی نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اس کے آگے ایک خندق کھود دی جائے۔اس کے بعد اگر وقت ملا اور مرزا صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو خندق کے ساتھ بانس گاڑ دیئے جائیں گے، جو قریباً ایک گز زمین کے اندر اور کوئی اڑھائی گز زمین کے باہر ہوں گے۔بانس کی یہ باڑھ زیادہ مضبوط نہیں ہوسکتی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ دشمن دیوار پھاندنے اور خندق عبور کرنے کے بعد براہ راست رہائشی مکان میں ہمارے آخری مورچوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔مکان کے مورچوں سے ہماری گولیاں خندق میں گرنے والوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گے۔مرزا صاحب کے پاس دو توپیں ہیں اور انھیں دروازے کے سامنے نصب کیا جائے گا۔اس کے علاوہ اس طرف صحن میں ایک کھائی کھودی جائے گی جس میں پچاس ساٹھ سپاہی چھپ کر بیٹھ سکیں گے۔اگر دشمن نے دروازہ توڑ کر اندر آنے کی کوشش کی تو اسے سب سے پہلے ہماری توپوں کی آتش بازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔پھر بھی یہ تمام انتظامات عارضی ہیں اور ایک غیر متوقع حملے کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مرہٹے پکی فصیل توڑنے یا پھاندنے کے بعد کسی منظم فرج کی بجائے ایک میلے کی بھیڑ کی شکل میں اندرونی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔اوران کا نصب العین صرف لوٹ مار ہوگا۔اگر ہم نے ایک باران کے دانت کھٹے کردیئے تو وہ دوبارہ حملہ کرنے

کی جرأت نہیں کریں گے۔"

شیر علی نے کہا۔"لیکن برخوردار! اتنے بڑے کام کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیے۔تمھارے خیال میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر پچاس ساٹھ آدمی روز کام پر لگائے جائیں تو یہ کام چند دن میں ختم ہو سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے مرزا صاحب کو میری بہت سی تجاویز سے اتفاق نہیں۔"

حسین بیگ نے شیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"مجھے معظم کی کسی تجویز سے اختلاف نہیں لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت وقت چاہیے۔اور پھر اگر یہ وہم غلط ثابت ہوا کہ مرہٹوں کی فرج محاذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آ نکلے گی تو شہر کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔اوروں کو تو چھوڑیئے میرے اپنے بیٹے واپس آ کر یہ کہیں گے کہ ابا جان آپ کو کیا ہو گیا تھا۔اب بھی یہ حالت ہے کہ مرشد آباد میں میرے بعض دوست میری دماغی حالت پر شبہ کرتے ہیں۔"

شیر علی نے کہا۔"مرزا صاحب! لوگوں کی نکتہ چینی کی پرواہ نہ کیجئے۔خدا کرے کہ مرشد آباد کے متعلق ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں گے لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹے اگر میدان جنگ سے اگر شکست کھا کر واپس چلے گئے تو ہمیں مستقبل میں کوئی اور خطرہ پیش نہیں آ سکتا،موجودہ دور میں ہمیں ہر وقت غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔عقل مند لوگ ہمیشہ بارش سے پہلے اپنے مکانوں کی چھتیں مرمت کرتے ہیں اور موجودہ زمانے میں بارش سے زیادہ دشمن کے حملے کے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔بعض گھٹائیں برسات کے موسم میں بھی برسے بغیر گزر جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جو لوگ بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی چھتوں اور پرنالوں کی مرمت کا کام شروع کر دیتے ہیں وہ

احمق ہیں۔"

حسین بیگ نے کہا۔"محلے میں میرے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہو چکی ہے کہ میرے پاس بڑا خزانہ ہے اور میں یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں۔"

شیر علی نے کہا۔"مرزا صاحب آپ اپنا کام جاری رکھیئے۔اگر آپ کے پاس خزانہ نہیں تو شاید کسی دن خزانوں والے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔جگت سیٹھ اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے بہت فکر مند ہے اب تک وہ اپنے محل کو دفاعی لحاظ سے مضبوط بنانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ چکا ہے۔مجھے اس نے اپنے محل کا محافظ مقرر کیا ہے لیکن اب تک میں نے جو کچھ کیا وہ معظم علی کی اس کارگزاری کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔معظم علی نے اس محلے کے لوگوں میں جو مدافعانہ جذبہ بیدار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے لیکن جگت سیٹھ نے جو کرایے کے سپاہی بھرتی کیے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو مجھے اندیشہ ہے کہ خطرے کے وقت وہ شاید اپنی بندوقوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں۔"

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رہائشی مکان کی دوسری طرف بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔شیر علی نے چونک کر کہا۔"یہ بندوق کی آواز شاید اندر سے آئی ہے۔"

حسین بیگ مسکرایا،"یہ افضل کی بہن ہو گی۔وہ بالائی منزل کے دریچے سے بندوق چلانے کی مشق کیا کرتی ہے۔"

تھوڑی دیر اور باتیں کرنے کے بعد شیر علی نے حسین بیگ سے رخصت چاہی۔معظم علی اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے کے لیے آیا۔دروازے پر پہنچ کر شیر علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔"معظم آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس

کے بعد مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کئی سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد بھی تمھارے مقابلہ میں میری معلومات بہت کم ہیں ۔ میں یہ چاہتا ہوں تم کسی دن تھوڑی دیر کے لیے جگت سیٹھ کے محل میں آ کر میرے انتظامات کا جائزہ لو ۔یقیناً تم مجھے کوئی کارآمد مشورہ دے سکو گے؟"

"آپ جس وقت حکم دیں میں حاضر ہوں گا۔"

"اگر فرصت ملے تو آج ہی کسی وقت آ جاؤ!۔"

"بہت اچھا، میں آج ظہر کی نماز کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔"

○

چند دن بعد حسین بیگ کے محل کے بیرونی احاطے اور فصیل کے دفاعی انتظامات مکمل ہو گئے تو معظم علی نے اندرونی چاردیواری کے ساتھ خندق کھودنے کو کہا۔

حسین بیگ نے جواب دیا۔"جو کچھ ہم کر چکے ہیں کافی ہے ۔ہمیں اس گھر کا حلیہ اس قدر نہیں بگاڑنا چاہیے کہ سارا مکان گرا کر از سرِ نو تعمیر کرنا پڑے۔"

"بہت اچھا چچا جان! جیسے آپ کی مرضی ۔اتنی تیاری سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم دشمن کو چند گھنٹے کے لیے ضرور روک سکیں گے۔"

معظم علی یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا لیکن حسین بیگ کے کانوں میں اس کے الفاظ دیر تک گونجتے رہے وہ سارا دن بے چین رہا اور رات کے وقت بھی اسے اچھی نیند نہ آئی ۔

اگلے دن علی الصباح معظم علی اپنے گھر میں گہری نیند سو رہا تھا کہ صابر نے

اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا ”مرزا صاحب باہر کھڑے ہیں۔“

”مرزا حسین بیگ؟“ معظم علی نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں سرکار شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔“

معظم علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

”آپ! اس وقت؟“ اس نے حسین بیگ کو دیکھتے ہی کہا۔

”دیکھو بیٹا“ حسین بیگ نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”کل تم سے باتیں کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ اتنا کچھ کیا ہے تو خندق بھی کھود دی جائے۔ لیکن وہ بس اتنی گہری ہو کہ دشمن اندرونی دیوار پھاندنے کے بعد آسانی سے مکان پر حملہ نہ کر سکے۔ لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد خندق کے آگے بانس بھاندھنے پر زور نہیں دو گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مرشد آباد کے لوگ مجھے سچ مچ پاگل سمجھنے لگ جائیں۔“

معظم علی جانتا تھا کہ ایک کام ختم ہونے کے بعد دوسرا کام شروع کروا دیں گے۔ تاہم اس نے کہا چچا جان میں تو خندق کے لیے بھی آپ کو مجبور نہیں کرتا۔“

”نہیں نہیں خندق ضرور کھودی جائے گی۔ میں اس کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ لوگ بھونکتے رہیں مجھے ان کی پرواہ نہیں۔“

”بہت اچھا چچا جان، لیکن آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں دیہات سے آدمی بلانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ شہر کے لوگ بیکار ہیں۔ یہ کام کرنے کی بجائے میرا مذاق اڑائیں گے۔ دوپہر تک میرے علاقے کے ڈیڑھ سو کسان یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑے تو دریا پار کی جاگیر کے کسانوں کو بھی بلوا لوں گا لیکن یہ کام چار دن کے اندر اندر ختم ہونا چاہیے۔“ حسین بیگ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تیسرے پہر حسین بیگ کے مکان میں کھودائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔اور اس کے لنگر خانے میں کوئی دوسو آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔

اگلے دن حسین بیگ کا ایک دوست اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا۔" مرزا صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟"

مرزا صاحب سے پہلے بھی کئی آدمی یہ سوال کر چکے تھے۔انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔" دیکھیے صاحب میرا مکان ہے۔اگر میں اسے کھود کر تالاب بنوا دوں تو بھی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔"

دوست نے دوبارہ اس موضوع پر زبان کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب وہ چلا گیا تو حسین بیگ نے ایک نوکر سے کہا:

" دیکھو آئندہ جو لوگ مجھ سے ملنے آئیں انھیں لانے کی بجائے باہر کی بیٹھک میں روک لیا کرو!"

چند دن بعد خندق تیار ہو گئی اور حسین بیگ نے حویلی سے بارش کا پانی خارج کرنے والی نالیوں کا رخ اسطرف پھیر دیا۔اس کے بعد اگلے دن محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ حسین بیگ کی حویلی میں بانسوں سے لدے چھکڑے چلے آ رہے ہیں، وہ حیران تھے۔لیکن کسی کو حسین بیگ کے سامنے اپنی حیرانی کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔

اس دوران میں معظم علی بلا ناغہ محلے کے رضا کاروں کو تربیت دیتا رہا لیکن ابتدائی جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور رضا کاروں کی تعداد بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہو رہی تھی۔تاہم اسے اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ محلے کے اکثر لوگوں کو بندوق چلانا سکھا چکا ہے۔اب وہ لوگ جو بظاہر اس کا مذاق اڑایا

کرتے تھے۔ درپردہ اپنے اپنے گھروں کی حفاظت کے انتظامات کررہے تھے۔ معظم علی کی تحریک کے اثر وت مرشد آباد کے دوسرے محلوں میں بھی پہنچ چکے تھے اور نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شہریوں میں مدافعانہ شعور بیدار کرنے کے لیے میدان میں آچکی تھی:۔

○

ایک دن معظم علی نے تمام رضا کاروں کو حسین بیگ کے مکان میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائیو اور بزرگو! چند ہفتے قبل مرشد آباد سے فوج کی روانگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر خدانا خواستہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آیا تو شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہمارا محلّہ انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاہی محل کے بعد ہمارا محلّہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اب اگر ہم پر کسی نے حملہ کیا تو وہ ہمیں بھیڑوں کی طرح نہیں ہانک سکے گا۔ پہلے تو ہم دشمن کو گلیوں کے دروازے سے باہر روکیں گے۔ پھر اگر وہ ہمارے ابتدائی مورچے توڑ کر اندر گھس آیا تو ہم اپنے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے گولیاں برسائیں گے۔ اس کے بعد اگر ہمیں اور پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ حویلی ہمارے لیے آخری حصار ثابت ہوگی۔ خطرے کے وقت محلّہ کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پناہ مل سکے گی اور ہم اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کر ان کی حفاظت کرسکیں گے۔ آپ اس حویلی کے اندر اور باہر اپنا اپنا مورچہ دیکھ چکے ہیں۔ اب وہ لائحہ عمل سن لیں جس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہوگا۔ خطرے کے وقت سب سے پہلے محل کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر پہرہ دینے والے رضا کار نقارے بجائیں گے آپ کو چاہیے کہ آپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو ابھی سے سمجھا دیں کہ وہ

کسی بدحواسی کا مظاہرہ نہ کریں اور نقارے کی آواز سنتے ہی اس حویلی کے رہائشی مکان میں جمع ہو جائیں۔ یہاں اتنی جگہ ہے کہ محلے کی تمام عورتیں اور بچے سما سکیں۔ نقارے کی آواز کے تھوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آج دوپہر کے بعد ہم اس کی مشق بھی کر لیں گے۔

شام سے قبل کسی وقت نقارے بجائے جائیں گے۔ اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں۔ دن کے وقت عورتیں اور بچے اپنی اپنی جائے پناہ دیکھ لیں گے اور اس کے بعد رات کو کسی وقت یہ مشق دوبارہ کی جائے گی۔

ایک عمر رسیدہ آدمی نے اٹھ کر سوال کیا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت بھی ہمارے بال بچوں کو اٹھ کر اس طرف بھاگنا پڑیگا؟''

معظم علی نے جواب دیا ہاں لیکن رات کے اندھیرے میں وہ بھاگ نہیں سکیں گے انھیں تاریک گلیوں سے گزر کر یہاں تک پہنچنا ہوگا۔ حویلی کے اندر صرف چند منٹ کے لیے مشعلیں جلائی جائیں گی تا کہ وہ اپنی اپنی جائے پناہ دیکھ سکیں۔''

ایک اور آدمی نے اٹھ کر کہا۔ ''لیکن یہ تو عجیب بات ہوگی عورتیں اور بچے رات کے وقت یہاں کیسے پہنچیں گے؟''

معظم علی نے جواب دیا۔ ''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دشمن صرف دن کے وقت حملہ کرے گا تو میں اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ تکلیف دینا گوارا نہ کرتا۔ لیکن موجودہ حالات میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ رات کے وقت اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو بھی ہمیں یہ مشق ضرور کرنی چاہیے، میں جانتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیش لوگ روز اول سے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ چند برس میں

ہندوستان بڑے بڑے شہر کئی بار کٹ چکے ہیں اور عافیت پسند لوگوں نے وہ مصائب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

کوئی فوج ایسے گھروں کی حفاظت نہیں کر سکتی جو اپنی اجتماعی ذمہ داریوں سے غافل ہوں۔ آپ کو یہ پریشانی ہے کہ رات کے وقت یہ مشق کی گئی تو عورتوں اور بچوں کو تکلیف ہو گی، دوسرے محلے کے لوگ ان کی چیخ و پکار سنیں گے تو ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن میں آپ کو ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے سے تیار کر رہا ہوں۔ میرے عزیزو اور بزرگو! آپ کو یہ معلوم نہیں جب غفلت کی نیند سونے والے لوگ اچانک بندوقوں کی آواز اور دشمن کے نعرے سن کر بیدار ہوتے ہیں اور انھیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک غیر متوقع مصیبت ان کے دروازوں پر دستک دے رہی ہے تو ان کی بدحواسی، خوف اور سراسیمگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بھائی کو اپنی بہن، والدین کو اپنے بچوں اور شوہر کو اپنی بیوی کی خبر نہیں ہوتی۔ پڑوسی اپنے پڑوسی کو نہیں پہچانتا۔ وہ تاریکی میں اپنے سائے سے ڈر کر بھاگتے ہیں اور انہیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے اپنے بھائی، بہن، بیوی، بچے، ماں باپ ان کے پیروں تلے کچلے جا رہے ہیں۔ اس افراتفری کے عالم میں اگر وہ بندوقیں اٹھاتے ہیں تو انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا ہدف دشمن ہے یا اپنا ہی کوئی ساتھی۔۔۔ حضرات میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہمیں واقعی کوئی خطرہ پیش آ رہا ہے۔ لیکن میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہماری حالت ان لوگوں سے بہتر ہو گی جو مصیبت کو اپنے سر پر دیکھ کر بیدار ہوتے ہیں۔۔۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ رضاکار جانے سے پہلے ایک بار پھر اپنا اپنا مورچہ اچھی طرح دیکھ لیں، اور جب نقارے بجائے جائیں تو کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ جائیں!"

ایک کم سن نوجوان نے اٹھ کر سوال کیا۔ ”جناب! نقارہ کس وقت بجایا جائے گا؟“

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ میں تمھیں نہیں بتاؤں گا۔“

○

دن کے تین بجے مرزا حسین بیگ کے مکان اور محلے کے مختلف گوشوں سے بیک وقت نقاروں کی صدائیں سنائی دینے لگیں اور رضا کار گھروں سے نکل کر اپنے مورچوں کی طرف بھاگنے لگے۔ چند منٹ بعد جب عورتیں، بچے اور بوڑھے حسین بیگ کے محل کا رخ کر رہے تھے محلے کا ایک آدمی جو شاہی محل کا محافظ فوج کے دستے کا افسر تھا، گھوڑا بھگاتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ گلی کا دروازہ بند پا کر اس نے گھوڑا روکا اور بلند آواز میں کہا۔ ”جلدی کھولو۔ جلدی کرو!“

دروازے کے ساتھ ایک مکان کی چھت پر رضا کاروں کا مورچہ تھا۔ ایک رضا کار نے اٹھ کر اسے دیکھا اور جواب دیا۔ ”دروازہ نہیں کھل سکتا تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔“

افسر چلایا۔ بے وقوف! میں شاہی محل سے فتح کی خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ مرہٹے شکست کھا کر میدان سے بھاگ رہے ہیں جلدی کرو دروازہ کھولو!“

آن ہی آن میں تمام رضا کار مورچہ چھوڑ کر گلی میں آ گئے۔۔۔ ان میں سے ایک دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا اور باقی ”فتح ہو گئی“۔۔ مرہٹے بھاگ گئے“ کے نعرے لگاتے ہوئے حسین بیگ کی حویلی کی طرف بھاگنے لگے۔ راستے میں حویلی کا رخ کرنے والے لوگوں نے ان کے نعرے آگے پہنچا دیئے اور آن ہی آن میں گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مرہٹے بھاگ گئے۔ ”فتح ہو گئی۔ ”فتح ہو گئی“

کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جو لوگ ابھی تک حویلی کی ڈیوڑھی سے باہر تھے وہ اندر جانے کی بجائے وہیں رک گئے اور جو اندر داخل ہو رہے تھے وہ کسی توقف کے بغیر باہر نکل آئے۔ اتنی دیر میں فتح کی خوشخبری لانے والا سوار بھی پہنچ گیا اور اس نے دروازے کے سامنے پوری قوت سے فتح کے نعرے لگا کر لوگوں کا ہجوم اپنے گرد جمع کرلیا۔ وہ رضا کار جو حویلی کے دروازے کا مورچہ چھوڑ کر آئے تھے۔ دروازے کے باہر چند نعرے لگانے کے بعد حویلی کے اندر داخل ہوئے اور انھوں نے بیرونی احاطے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فتح کی خبر پہنچا دی۔ اور ان کے ساتھی فصیل پر اپنے مورچے چھوڑ کر نعرے لگاتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ معظم علی لوگوں کا شور سن کر بیرونی احاطے سے باہر نکلا اور بلند آواز میں چلایا۔ ''تم کہاں بھاگ رہے ہو؟'' لیکن اس کی آواز ''جنگ ختم ہوگئی''۔ ''مرہٹے بھاگ گئے۔'' کے نعروں میں دب گئی۔

اس نے ایک رضا کار کو گردن سے جھنجھوڑتی ہوئے کہا۔ ''تمھیں فصیل سے اترنے کی اجازت کس نے دی۔ جاؤ اپنے مورچے میں!''

نوجوان مرعوب سا ہو کر دوبارہ لکڑی کی سیڑھی سے فصیل پر چڑھ گیا۔ دوسرے رضا کار تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے۔ معظم علی غضب ناک ہو کر چلایا۔ ''تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اپنے مورچوں میں!''

وہ بادل ناخواستہ دوبارہ اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ لیکن ان کے آگے باقی ساری فصیل کیمورچے خالی ہو چکے تھے اور دروازے کی سمت لوگوں کے نعرے ہر آن بلند ہو رہے تھے۔۔ معظم علی بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ معظم علی کو دیکھ کر ایک رضا کار نے بلند آواز میں کہا۔ ''ہماری

فوج کو فتح ہوئی ہے۔ مرہٹے اب اس طرف نہیں آئیں گے۔ اب آپ کو اس محلے کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔‘‘

معظم علی نے کہا۔ ’’اگر فتح کی خبر سننے کے بعد تمھاری افراتفری کی یہ حالت ہے تو مجھے اب زیادہ فکر ہونی چاہیے۔‘‘

رضا کار نے جواب دیا۔ ’’اشرف خان شاہی محل سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا۔ ہم گلی کا دروازہ بند کر چکے تھے کہ وہ آ پہنچا۔‘‘

’’اور تم نے دروازہ کھول دیا؟‘‘

’’ہاں‘‘۔

’’لیکن میری ہدایت تھی کہ جب تک دوسرا بقارہ نہ بجا جائے گلیوں کے دروازے نہ کھولے جائیں۔‘‘

’’لیکن وہ فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔‘‘

معظم علی نے کہا۔ ’’تم جیسے احمق کبھی کبھی بڑی سے بڑی فتح کو بھی شکست میں بدل دیتے ہیں۔ اگر مجھے وہ اختیارات ہوتے جو فوج کے ایک افسر کو اپنے ماتحت سپاہی پر ہوتے تو میں تمھیں بدترین سزا دیتا۔‘‘

دوسرے رضا کار نے کہا۔ ’’لیکن جناب اب تو کوئی بھی اپنے مورچے پر نہیں۔ گلیوں کے تمام پہرے دار ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہیں۔‘‘

معظم علی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند بچے اور عورتیں جن کے لیے اندر یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ڈیوڑھی کی دیواروں کے ساتھ سمٹی ہوئی تھیں۔ باہر اشرف خان کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ ان کے سامنے جنگ کی ایسی تفصیلات بیان کر رہا تھا جن کا واقعات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاہی محل کے ایک

سپاہی نے صرف یہ سنا تھا کہ مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ بنگال کی افواج میدان میں دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگانے کے بعد سرحد کے پار ان کا تعاقب کر رہی ہے۔

چند عورتیں یہاں بھی ہجوم کے درمیاں پھنسی ہوئی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے۔ معظم علی نے لوگوں کو ملامت کیا اور وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

اشرف خان، معظم علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے کہا۔ ''جناب آپ فتح کی خبر سن چکے ہیں؟''

''میں سن چکا ہوں۔ اور اب میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ہٹ جایئے۔ چند خواتین ڈیوڑھی کے اندر پھنسی ہوئی ہیں۔''

معظم علی یہ کہہ کر واپس مڑا اور اس نے حسین بیگ کے ایک نوکر کو جو ابھی تک ڈیوڑھی کی چھت پر اپنے مورچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نقارہ بجانے کے لیے کہا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب نقارہ بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو یوں بھی سب لوگ چھٹی کر چکی ہیں۔''

معظم علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ معظم علی انھیں دیکھ کر لوٹ آیا اور دروازے کے پاس ہی چھپر کے نیچے پڑی ہوئی ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسین بیگ کا ایک نوکر باہر نکلا اور معظم علی نے اس سے پوچھا۔ ''مرزا صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ اس وقت کتب خانے میں ہیں۔''

''اچھا اب تم خواتین سے کہو کہ ان کے لیے راستہ خالی ہو چکا ہے۔''

''بہت اچھا۔لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو بندوقیں اسلحہ خانہ سے تقسیم کی گئی تھیں ان کے متعلق کیا ہدایت ہے؟''

معظم علی نے کہا''ابھی انھیں رضا کاروں کے پاس رہنے دو۔''

تھوڑی دیر بعد محلے کے ہر گھر میں مرزا حسین بیگ کے متعلق اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں:

''مرزا صاحب کو کسی نجومی نے بتایا تھا کہ مرہٹے تمھارے محل پر حملہ کریں گے''

۔۔۔''اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو اس کے گھر میں گھس آئے ہیں۔۔''حسین بیگ ایک سیدھا سادہ آدمی ہے۔اور محمود علی کے لڑکے نے اسے بیوقوف بنایا۔''

رات کے وقت فتح کی خوشی میں محلے کی ہر گلی میں چراغ جلائے جا رہے تھے ۔جگت سیٹھ کے محل میں آتش بازی چلائی جا رہی تھی۔حسین بیگ کے محل میں بھی چراغاں ہو رہا تھا۔بازاروں اور گلیوں میں چہل پہل تھی۔معظم علی عشاء کی نماز کے بعد اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا گذشتہ چند دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔جمال خان نیچے صحن میں اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔اچانک معظم علی کو گلی میں شور سنائی دیا اور اس نے اوپر سے آواز دی:

''صابر!صابر!''

جمال خان نے جواب دیا۔''جی صابر ابھی باہر گیا ہے۔''

معظم علی نے کہا۔''اچھا تم جا کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے؟''

جمال خاں بھاگ کر باہر نکلا۔لیکن چند منٹ تک وہ واپس نہ آیا تو معظم علی نیچے اتر آیا جب وہ باہر نکلا تو جمال خاں اور صابر واپس آتے دکھائی دیئے۔

معظم علی نے کہا۔ ''بہت دیر لگائی تم نے کیا بات تھی؟''

جمال خاں نے جواب دیا۔ ''جی کچھ نہیں محلے کے چند لڑکے صابر کے ساتھ لڑ رہے تھے، میں پہنچا تو وہ بھاگ گئے۔''

''کیا بات تھی صابر؟''

صابر نے جواب دیا۔ ''جی وہ آپ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انھوں نے مرزا صاحب کے متعلق بھی بہت واہیات باتیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نے لوگوں کو بیوقوف بنایا تھا اور مرزا صاحب کیساتھ کسی نجومی نے مذاق کیا تھا۔ ان باتوں پر مجھے غصہ آ گیا۔''

''میں جانتا ہوں جو کچھ انھوں نے کہا ہو گا۔ تمھیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

''جی نہیں ذرا نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ لیکن میں نے دو لڑکوں کو خوب پیٹا ہے۔''

''بہت برا کیا تم نے۔ بڑوں کو بچوں کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیے۔''

''جناب وہ بچے کہاں تھے، ایک تو مجھ سے بھی آدھ بالشد اونچا تھا۔''

''اچھا اب آرام کرو اور آئندہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو تمھیں لڑنے کی ضرورت نہیں:۔''

......

تیسرا باب

اگلے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے معظم علی صبح کا ناشتہ کھا کر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے قریب حسین بیگ کا نوکر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ مرزا صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

معظم علی محل میں پہنچا، حسین بیگ دیوان خانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی کو دیکھتے ہی کہا۔ ''آؤ بیٹا میں ابھی شاہی محل کے ناظم اور مرشد آباد کے فوج دار سے مل کر آیا ہوں۔ فتح کی خبر درست ہے۔ ہماری فوج نے کٹوے پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ مرہٹوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے کٹوے اور آس پاس کی بستیوں میں خوراک کے تمام ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور فوج کا سامان رسد بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج مرشد آباد سے سامان بھیجا جا رہا ہے۔ مرہٹے بھاری نقصان اٹھا کر کٹوے سے چند میل پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن ابھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واپس چلے جائیں گے یا کوئی اور محاذ تلاش کریں گے۔ بحر حال خدا کا شکر ہے کہ مرشد آباد کو اب کوئی خطرہ نہیں تمھیں محلے کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے لوگ بکتے رہیں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں فوج کے واپس آ جانے کے بعد بھی اپنی حویلی کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کا کام جاری رکھوں گا۔ برسات کے بعد بیرونی فصیل کی مرمت کی جائے گی اور اندرونی دیوار کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے گا۔ اور یہ سارا کام تمھاری مرضی کے مطابق ہو گا۔''

معظم علی نے کہا۔ ''چچا جان میں لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہوں اور میرے نزدیک مرشد آباد کا خطرہ کم نہیں ہوا۔ کٹرے سے فرار ہونے کے بعد

مرہٹے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بنگال کا کون سا شہر ایسا ہے جس پر وہ آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں اور جہاں سے انھیں زیادہ سے زیادہ مال غنیمت مل سکتا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ان کا ہدف میدنا پور یا کٹک ہوگا۔ یا وہ مرشد آباد کا رخ کریں گے۔ ان کے لیے مرشد آباد پہنچنا نسبتاً مشکل ہوگا۔ لیکن اگر انھوں نے مرشد آباد کی دولت کا دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا تو وہ مشکلات کی پرواہ نہیں کریں گے۔''

حسین بیگ نے کہا۔ ''مرشد آباد کی دفاعی حالت اتنی کمزور نہیں۔ فوج اگر چہ یہاں کافی نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ بیرونی حملہ آور کو ایک دو دن بھی روک نہ سکے۔ پھر علی وردی خاں اتنا ناداں نہیں کہ وہ مرشد آباد کو خطرے میں دیکھ کر کٹوے میں بیٹھا رہے۔ اگر مرہٹوں نے اس طرف کا رخ کیا تو علی وردی خاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ جائے گا۔''

معظم علی نے کہا۔ ''اور یہی بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ دشمن کو اگر مرشد آباد کا رخ کرنے میں کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ صرف علی وردی خاں کی توجہ دوسرے محاذ پر مبذول کرنے کے لیے چند دستے مرشد آباد کی طرف روانہ کرسکتا ہے۔ دور الحکومت کو خطرے میں دیکھ کر علی وردی خاں ایک لمحہ کے لیے بھی کٹوے میں ٹھہرنا گوارا نہیں کریں گے۔۔ بے شک ان کے یہاں پہنچ جانے سے مرہٹوں کا بھاگ جانا یقینی ہے۔ لیکن مرہٹوں کی باقی فوج کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر میدنا پور پر قبضہ کرلے گی اور اس کے بعد بردوان کا سارا علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔''

حسین بیگ نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ ''تو پھر علی وردی خاں کو کیا کرنا چاہیے؟ تمھارا خیال ہے اگر مرہٹوں کا کوئی لشکر مرشد آباد پہنچ جائے تو اسے ان کا پیچھا نہیں

کرنا چاہیے۔؟"

"نہیں چچا جان، میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی وردی خاں کے سالاروں نے اسے صحیح مشورہ دیا تو اس فتح کے بعد مرہٹوں کو کسی اور محاذ کا رخ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔میرے خیال میں یہی چند دن ایسے ہیں جب مرہٹوں پر ضرب کاری لگائی جا سکتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا۔"اچھا بتاؤ اگر تم علی وردی خاں کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

معظم علی مسکرایا اور اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔"میں اگر ان کی جگہ ہوتا۔تو اس فتح کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کا تعاقب جاری رکھتا۔میں کٹوے میں پڑاؤ ڈال کر مرشد آباد اور دوسرے شہروں سے سامان رسد کا انتظار کرنے کی بجائے بھوکے سپاہیوں کو یہ کہتا کہ ہمارے پاس رسد کی کمی ہے۔لیکن ہم مرہٹوں سے اناج کے وہ ذخیرے چھین سکتے ہیں جو انھوں نے اس علاقے کو لوٹ کر جمع کیے ہیں۔اس صورت میں مرہٹوں کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسئلہ ہوتا۔ مرہٹے کسی منظم فوج کے سپاہی نہیں صرف لٹیرے ہیں۔ان کی گزشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک محاذ سے نقصان اٹھانے کے بعد جوابی حملہ کے لیے ہمیشہ کوئی نیا محاذ تلاش کرتے ہیں اور اگر ان کا مدمقابل ہو تو وہ تیاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے صلح کی بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔یہ ان پر یلغار کا وقت ہے۔لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کٹوے میں فتح کا جشن منایا جا رہا ہوگا۔انعامات خلعتیں تقسیم ہو رہی ہوں گی۔اور مرہٹے چند میل دور اپنے پڑاؤ میں کسی نئے محاذ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔پھر رسد کا سامان پہنچے گا۔سپاہی اور افسر چند خوشیاں

منائیں گے۔ پھر جنگ کی تیاری ہوگی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پنڈت بھاسکر نے صلح کی بات چیت شروع کردی ہو اور جس دن یہ بات چیت ختم ہو۔۔

علی وردی خاں کو یہ اطلاع ملے کہ مرہٹوں کی فوج کا ایک حصہ کٹوے سے پچاس یا سو کوس دور ہمارے کسی اور علاقے یا شہر میں لوٹ مار شروع کرچکا ہے۔ مجھے علی وردی خاں کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے لیکن میں ایک حکمران کی سیاسی مصلحتوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو آج بنگال کی فوجیں کتوے سے کوسوں دور مرہٹوں کا تعاقب کررہی ہوتیں۔ ان کے رسد اور بارود کے چھکڑے اور ان کی توپیں ہمارے قبضہ میں ہوتیں، پنڈت بھاسکر اگر صلح کے لیے ایلچی بھیجتا تو میں یہ جواب دیتا کہ صلح کی بات چیت صرف بنگال کی سرحدوں سے باہر ہوسکتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "لیکن میر مدن، علی وردی خاں کے ساتھ ہے اور تم ہمیشہ یہ کہا کرتے ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند سپاہی ہے!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "وہ یقیناً ہماری فوج کے تمام جرنیلوں سے زیادہ دور اندیش ہیں لیکن میدان جنگ سے باہر علی وردی خاں کے نزدیک ایسے لوگوں کی اہمیت عام طور پر کم ہوجاتی ہے، دربار میں وہ میر جعفر اور رولب رام جیسے خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی باتیں زیادہ غور سے سنتے ہیں۔"

حسین بیگ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ہاں معظم آج صبح چند آدمی بندوقیں واپس کرنے آئے تھے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہا کہ جب تک فوج واپس نہیں آتی یہ تمھارے پاس امانت رہیں گی۔ تم بھی یہی چاہتے تھے نا؟"

"جی ہاں۔"

’’لیکن اب تمھارے رضا کار پریڈ کے لیے آنا تو شاید پسند نہ کریں!‘‘

’’پریڈ کی ضرورت نہیں وہ ابتدائی تربیت حاصل کر چکے ہیں اب صرف رات کے وقت محلے میں پہرہ دینے کی ضرورت ہے۔فتح کی خبر سننے کے بعد ایسی باتوں سے لوگوں کی دلچسپی ذرا کم ہوگئی ہے۔لیکن دو چار دنوں بعد وہ پھر سنجیدگی کے ساتھ میری باتیں سننے لگ جائیں گے:۔‘‘

○

شام کے وقت بارش ہورہی تھی۔مرشدآباد کے قائم مقام فوج دار کے ہاں شہر کے چند روسٔا اور سرکاری عہدہ داروں کی دعوت تھی۔جب مہمان ایک کشادہ کمرے میں دسترخواں پر بیٹھ گئے تو کسی نے فوج دار سے مرزا حسین بیگ کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔

فوج دار نے جواب دیا۔’’ان کا پیغام آیا ہے کہ ان کی طبعیت ٹھیک نہیں۔‘‘

ایک شخص نے کہا جناب مرزا صاحب آج کل یوں بھی اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے۔‘‘

دوسرا بولا۔’’ بھئی جب گھر میں کام ہو تو باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا صاحب آج کل بہت مصروف ہیں۔آپ ان کی حویلی کے اندر جا کر دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔‘‘

ایک اور آدمی فوج دار سے مخاطب ہوکر بولا۔’’جناب اگر آپ مرزا صاحب کو یہ یقین دلاتے کہ اب مرشدآباد کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ ضرور تشریف لاتے!‘‘

فوج دار نے کوئی جواب نہ دیا۔لیکن اس کے مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا حسین بیگ پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

شہر کے ایک تاجر نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے محلے کے لوگوں کو رات بھر سونے نہیں دیتے۔“

مرشد آباد کا کوتوال بولا۔ ”مرزا صاحب ایک سیدھے سادے بزرگ ہیں لیکن ان کے محلے کا ایک نوجوان ان کے ساتھ دل لگی کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ان کے محلے سے گزر رہا تھا تو بانس سے بھرے ہوئے چھکڑے ان کی حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے میں نے ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اندر مورچے بنوا رہے ہیں۔“

”بانس کے مورچے؟“ ایک امیر زادے نے کہا۔ ”آپ کے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا؟“

”جی نہیں، آپ مرزا صاحب کی حویلی دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد حسین بیگ اس گفتگو کا واحد موضوع بن چکا تھا۔ اور قریباً ہر شخص اس گفتگو میں دل چسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوج دار ایک سنجیدہ آدمی تھا اور اسے یہ باتیں ناگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ لیکن جب مہمان زیادہ بے تکلف ہو کر حسین بیگ کا مذاق اڑانے لگے تو اس نے کہا۔ ”مرزا صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس محفل میں انھیں موضوع بحث بنایا جائے۔“

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ ”جناب مرزا صاحب کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن بانسوں سے مورچے تعمیر کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا بانس گولی روک سکتے ہیں؟“

فوج دار نے جواب دیا۔ ”بانس گولی نہیں روک سکتے لیکن گولی چلانے والے

کو آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں۔ میں نے خود مرزا صاحب کی حویلی کے دفاعی انتظامات دیکھے ہیں۔ اور وہاں مجھے کوئی بات مضحکہ خیز نظر نہیں آئی۔ ان کا محلہ شہر سے باہر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خطرے کے وقت اس محلے کے لوگ شہر کے لوگوں کی نسبت کم محفوظ نہیں ہوں گے۔"

ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا فوج دار کے قریب پہنچا اور اس نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

فوج دار نے دستر خوان سے اٹھتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا اور کہا!

"آپ اطمینان سے کھانا کھائیں میں ابھی آتا ہوں۔"

فوج دار کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں ایک فوجی افسر کھڑا تھا۔ اس نے سلام کے بعد کہا "جناب معاف کیجئے میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی لیکن خبر بہت تشویش ناک ہے۔ مرہٹوں کی ایک فوج یلغار کرتی ہوئی مرشد آباد کی طرف بڑھ رہی ہے!"

فوج دار نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا یہ خبر کون لایا ہے؟"

"ابھی راستے کی ایک چوکی کا ایک کمان دار یہاں پہنچا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ پچھلی چوکیوں کے سپاہیوں نے ڈاک گھوڑوں پر یہ خبر اس تک پہنچائی تھی۔ میں نے تصدیق کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔"

"اور خبر لانے والا کہاں ہے؟"

"جی میں اسے محل کے ناظم کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ وہ تھکاوٹ سے نڈھال تھا۔ اس نے صبح سے لے کر شام تک لگاتار سفر کیا ہے اور راستے میں کئی گھوڑے تبدیل کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں اپنی چوکی سے روانہ ہوا تھا تو مرہٹے صرف

ایک منزل پیچھے تھے اور اب یہاں سے شاید وہ دو یا تین منزل دور ہوں گے۔ ''اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ تم شہر میں منادی کرا دو!۔''

افسر نے سلام کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

فوج دار دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

کسی نے سوال کیا جناب کیا بات تھی؟''

فوج دار نے دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں ایک سرکاری اعلان تھا ۔آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔''

لیکن مہمان کھانے سے زیادہ فوج دار کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر فوج دار دستر خوان سے اٹھا اور اس نے کہا۔'' حضرات مجھے کچھ کام ہے۔ اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن آپ آرام سے باتیں کریں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔''

ایک امیر زادے نے سوال کیا۔ ''آپ اس بارش میں کہاں جا رہے ہیں؟''

فوج دار نے جواب دیا۔ ''ایک سپاہی کو بارش میں چلنے کا عادی بننا پڑتا ہے مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔''

مجلس پر سناٹا چھا گیا اور حاضرین بدحواس ہو کر ایک دوسر ےکی طرف دیکھنے لگے۔ فوج دار نے کہا۔ ''لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی یہاں سے کئی منزل دور ہیں۔ اگر انہوں نے انتہائی کوشش کی تو بھی کل صبح یا دوپہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔''

فوج دار باہر نکل گیا۔

چند ثانیے بعد معزز مہمانوں کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے اپنے

جوتے پہچاننا بھی مشکل تھا۔کوئی اپنے جوتے پہننے کی بجائے کسی اور کے جوتے پہننے کی کوشش کررہا تھا۔کوئی بدحواسی کی حالت میں دائیں پاؤں کے جوتے بائیں پاؤں میں ڈال رہا تھا، پھر مکان سے نکلنے کے بعد پہلی بار بھاگنے کی مشق کررہے تھے:۔

○

تھوڑی دیر بعد مرشد آباد کے ہر گلی کوچے میں مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر مشہور ہو چکی تھی ۔مرزا حسین بیگ کے محلے کی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان موسلا دھار بارش میں اس کی حویلی کا رخ کررہے تھے۔ایک ساعت کے اندر اندر رہائشی مکان کی نچلی منزل اور دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی ۔بعض لوگ افراتفری کے عالم میں بارش سے بچنے کے لیے چاردیواری سے باہر غلے اور چارے کے گوداموں،نوکروں کی کوٹھریوں اور گھوڑوں کے اصطبل میں پناہ لے رہے تھے۔

معظم علی محلے کی گلیوں کے ناکے دیکھنے اور پہرا داروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پانی اور کیچڑ سے لت پت حویلی میں داخل ہوا۔ڈیوڑھی کے اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں اور حسین بیگ چند آدمیوں کے درمیاں کھڑا تھا۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوکر سوال کیا۔" فوج دار کی طرف سے کوئی جواب آیا؟"

"ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو اہل شہر کو خبردار کرنے کے لیے توپیں چلادی جائیں گی۔انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مرہٹہ دستوں کی قیادت میر حبیب کررہا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔" آپ اندر جا کر آرام کریں ۔میں گلیوں کے تمام ناکے

دیکھ آیا ہوں ۔۔ ہمارے انتظامات بہت تسلی بخش ہیں۔''

حسین بیگ نے کہا''اگر آج رات اس گھر کی چار دیواری کے اندر کوئی آرام کر سکے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ محشر کے دن بھی اطمینان کی نیند سو سکے گا۔ ذرا جا کر دیکھو، تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ انسان اتنا شور مچا سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ روئے زمین کے تمام ہنگامے میرے گھر کی چار دیواری کے اندر جمع ہو گئے ہیں ۔ ہر شخص اپنے پورے خاندان کو ایک ہی کمرے کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے مردوں کو عورتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ایک دروازے سے نکلتے ہیں اور دوسرے دروازے سے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔''

معظم علی نے کہا''چچا جان میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آدھ گھنٹے بعد آپ کسی کی آواز نہیں سنیں گے۔ آیئے میرے ساتھ!''

حسین بیگ نے کہا۔''نہیں میں آدھ گھنٹے کے لیے اندر جانے کی بجائے ساری رات یہاں کھڑا رہنا آسان سمجھتا ہوں مجھے ڈر ہے کہ میں اندر جا کر کسی کا گلہ گھونٹ دوں گا۔''

معظم علی نے ڈیوڑھی میں جمع ہونے والے مسلح رضا کاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

''تم دروازہ بند کر دو اور میرے ساتھ آؤ''۔

رضا کاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ معظم علی موسلا دھار بارش میں حویلی کے اندرونی صحن کی طرف بڑھا۔ حسین بیگ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا پھر بھاگتا ہوا ان کے ساتھ جا ملا۔ رہائشی مکان کے برآمدوں اور کمروں میں ایک طوفان حشر بپا تھا۔ حسین بیگ کے نوکر جگہ جگہ مشعلیں لیے کھڑے تھے۔

معظم علی برآمدے میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا۔ خاموش! خاموش!!"

برآمدے میں اس کے پاس چند لوگ خاموش ہو گئے لیکن مکان کے باقی حصوں میں چیختے چلاتے انسانوں کے ہجوم کو اس کی آواز متاثر نہ کرسکی۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ اوپر جا کر دیکھیں اگر بالائی منزل میں جگہ ہے تو عورتوں اور بچوں کو وہاں بھیج دیا جائے۔"

حسین بیگ نے جواب دیا۔ "بالائی منزل پر عورتوں اور بچوں کے لیے کافی جگہ ہے لیکن مردوں کی بدتمیزی دیکھ کر میں نے سیڑھی کے دروازے پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔"

آپ تالا کھول دیں۔ میں انھیں سنبھال لوں گا۔"

"تم پہلے تسلی کر لو ورنہ یہ دروازہ کھلتے ہی بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اوپر بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ خدا کے لیے خاموش کرو۔ ورنہ میں واقعی کسی کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔"

"یہ ابھی خاموش ہو جائیں گے۔"

معظم علی نے ایک رضاکار کے ہاتھ سے بندوق لی اور صحن کی طرف منہ کر کے ہوا میں فائر کر دیا۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر کے ہر گوشے میں سناٹا چھا گیا۔ معظم علی نے ان کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا:۔

"بھائیو اور بہنو! ابھی دشمن کئی میل دور ہیں اور صبح تک مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم نے تمھاری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر

تمھاری افراتفری کا یہی عالم رہا تو تمھارے محافظوں کے لیے یہ چیخ و پکار اور یہ بد نظمی دشمن کی گولیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی میں تمھیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے میری ہدایات کی خلاف ورزی کی تو اس کی حفاظت ہمارے ذمہ نہیں ہوگی ہم اسے اس حویلی سے باہر نکال دیں گے میری ہدایات یہ ہیں: ۔وہ تمام آدمی جن کی عمر پچاس سال سے کم ہے فوراً باہر نکل آئیں انھیں بیرونی صحن کی کوٹھریوں میں جگہ دی جائے گی خواتین جن کے ساتھ کم سن بچے ہیں، بالائی منزل کے کمروں میں چلی جائیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور عمر رسیدہ یا بیمار لوگ دیوان خانے کے کمروں اور برآدوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔جن خواتین کو بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہ مل سکے وہ نچلی منزل کے باقی کمروں میں رہیں۔

حملے کے وقت جو لوگ لڑنے کے قابل ہوں گے اور جن کے پاس کوئی ہتھیار ہو وہ رضاکروں کے ساتھ شامل ہو جائیں۔اگر بارش تھم گئی تو وہ اندرونی صحن کے مورچوں میں پناہ لے سکیں گے ۔ورنہ برآمدوں اور نچلی منزل کے کمروں میں ان کے لیے کافی جگہ ہوگی۔دس منٹ کے بعد میں مکان کے تمام کمروں کا معائنہ کروں گا۔اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر میری ہدایات پر عمل نہیں کیا تو اسے کسی اچھے سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔آدھ گھنٹے کے بعد تمام مشعلیں بجھا دی جائیں گی میں آپ کی تسلی کے لیے ایک بار پھر اعلان کرتا ہوں کہ صبح تک حملے کا کوئی خطرہ نہیں ۔آپ اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہیں ۔اسوقت ہماری ساری توجہ حویلی کے دفاعی انتظامات پر صرف ہونی چاہیے۔اور میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔‘‘

قریباً پون گھنٹہ بعد حویلی میں مکمل سکون تھا اور معظم علی حسین بیگ سے کہہ رہا تھا ''چچا جان اب آپ اوپر جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔''

حسین بیگ نے جواب دیا بیٹا میں صرف شور سے گھبراتا تھا۔ اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ میں رضا کاروں کے ساتھ باہر کی فصیل پر پہرہ دینا چاہتا ہوں: ''۔

O

اگلے دن دس بجے کے قریب میر حبیب کی قیادت میں مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کے مضافات میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ حملہ آور فوج کے ایک دستے نے حسین بیگ کے محلے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گلی کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چند اور دستے آ گئے اور انھوں نے ایک گلی کے ناکے کے آس پاس چند مکانات کی چھتوں پر قبضہ کر کے رضا کاروں کو پیچھے ہٹا دیا اور محلے کے اندر داخل ہو گئے۔ محلے کی گلیاں اور مکانات خالی دیکھنے کے بعد انھوں نے حسین بیگ کی حویلی کی طرف توجہ کی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اچانک ڈیوڑھی کی چھت اور فصیل کے مورچوں سے گولیاں برسنے لگیں اور وہ گلی میں چند لاشیں چھوڑ کر آس پاس کے مکانات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کے ایک اور دستے نے دوسری طرف سے فصیل کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن حویلی کے محافظوں نے اسے بھی مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہ آس پاس کے مکانات کی چھتوں پر لیٹ کر گولیاں چلاتے رہے۔ اتنی دیر میں ان کے کئی اور ساتھی اس محلے میں جمع ہو چکے تھے۔ مرہٹوں نے

اچانک مشرقی سمت میں حویلی کے قریب ایک دومنزلہ مکان کی چھت سے فائر شروع کیےتو اس طرف فصیل کے محافظ ان کی گولیوں کی ذد میں تھے۔چند رضا کار زخمی ہوئے اور باقی بلندی سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے مورچوں میں دبک گئے۔مرہٹوں کے چند دستوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اوراچانک گلیوں اورمکانوں سے نکل کرفصیل کے اس حصہ پر دھاوابول دیاان کے چندآدمیوں نے فصیل کے ساتھ بانس کی سیڑھیاں کھڑی کردیں اورآن کی آن میں کوئی پچاس آدمی فصیل پر پہنچ گئے فصیل کے محافظ آس پاس کے مورچوں سے نکل کراس طرف بڑھے۔لیکن مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سامنے ان کی پیش نہ گئی چند منٹ دست بدست لڑائی کے بعد مرہٹے فصیل کے مشرقی حصہ پر قابض ہو چکے تھے۔اورحویلی کے محافظ صحن میں جمع ہو کرانہیں نیچے اترنے سے روکنے کی کوشش کررہے تھے۔

معظم علی ڈیوڑھی کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔اچانک اس نے ایک رضا کار سے کہا

”پسپائی کے لیے نقارہ بجادو۔“

رضا کار نے اس کے حکم کی تعمیل کی اوربیرونی فصیل کے محافظ نقارے کی آواز سنتے ہی اپنے اپنے مورچے چھوڑ کراندرونی صحن کے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔کے نیچے لڑنے والے رضا کاروں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کرمرہٹے انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کررہے تھے۔معظم علی جلدی سے نیچے اترا اورآٹھ دس نوجوانوں کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔

اس حملے کی شدت نے مرہٹوں کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا اور

رضا کار ایک منظم طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

مرہٹوں نے اپنی فتح یقینی سمجھ کر چند آدمیوں کے بچ نکلنے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور انہیں نے آگے بڑھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔قریباً آٹھ سو مرہٹے سیلاب کے ریلے کی طرح بیرونی صحن میں داخل ہوئے۔لیکن اس عرصے میں اندرونی اور بیرونی چار دیواری کے درمیان کا وسیع احاطہ حویلی کے محافظوں سے خالی ہو چکا تھا۔مرہٹہ لشکر کا ایک سردار چلایا۔"بہادرو! ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جاؤ۔"

سپاہیوں نے کسی توقف کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔لیکن چند ثانیے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو خندق میں گرتا دیکھ کر انتہائی بدحواسی کی حالت میں چلا رہا تھا۔"یہ مکان نہیں قلعہ ہے۔ہم نے مفت میں اتنی جانیں گنوائی ہیں۔دروازے کی طرف بڑھو!"

اندرونی صحن کا دروازہ مرہٹوں کے بے پناہ ہجوم نے ایک ہی دگ کے میں توڑ دیا۔۔وہ فتح کے نعرے لگاتے ہوئے ایک میلے کی بھیڑ کی طرح آگے بڑھے۔ اندرونی دروازے اور رہائشی مکان کے درمیاں کشادہ صحن کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں ایک کھائی تھی۔جس کے دونوں سرے خندق سے ملے ہوئے تھے۔اس کھائی کے اندر ساٹھ رضا کار اپنے نوعمر سالار کی آواز کی منتظر تھے۔کھائی کے اندر دو چھوٹے چھوٹے خیموں کے اندر توپیں نصب تھیں جن کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

حملہ آور لشکر کا سردار کھائی سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا ٹھہرو!" اور مرہٹوں کا ہجوم رک گیا۔

مرہٹہ سردار نے قدرے توقف کے بعد کہا'' ۔اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر موریچوں سے نکل آؤ، ورنہ ہم ایک آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے ۔ہم جانتے ہیں کہ اس محلے کے تمام آدمی اس مکان میں جمع ہیں ۔اگر تم اپنی عورتوں کی عزت اور بچوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو ۔ورنہ۔۔۔!''

سالار اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔مکان کی چھت سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا اس کے ساتھ ہی صحن اور برآمدوں کے مورچوں، مکان کی چھت اور کھڑکیوں سے گولیوں کی بارش ہوگئی ۔مرہٹے طیش میں آکر چند قدم آگے بڑھے اور پھر الٹے پاؤں دروازے کی طرف بھاگنے لگے ۔اچانک یکے بعد دیگرے توپوں کے دو خوف ناک دھماکے سنائی دیئے اور لوہے کے بے شمار ٹکڑوں نے دروازے کے سامنے کئی گز تک لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے ۔

اس کے بعد حملہ آور اے ٹوٹے ہوئے دروازے کو ہزاروں خندقوں اور کھائیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر درمیانی دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے ۔ان کے سو سے زیادہ آدمی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے ۔قریباً دو گھنٹے اور گزر گئے اور حویلی کے محافظوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اس کے بعد ٹوٹے ہوئے دروازے کے قریب دیوار کے عقب سے سفید جھنڈا نمودار ہوا ۔اور کسی نے بلند آواز میں کہا:

''ہم صلح کی بات چیت کے لیے ایک آدمی اندر بھیجنا چاہتے ہیں ۔''

جب چند ثانیے اندر سے جواب نہ آیا تو کسی نے دوبارہ کہا۔''ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صلح کی بات چیت کے لیے ہمارا ایک آدمی اندر آ سکتا ہے یا نہیں؟''

معظم علی صحن کے مورچے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جواب دیا۔ ”تم ایک آدمی اندر بھیج سکتے ہو۔“

مرہٹہ فوج کا ایک افسر سفید جھنڈا اٹھائے دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور راستے میں بکھری ہوئی لاشوں سے بچ بچ کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا وہ معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر رکا اور بولا۔۔ ”ہمیں تمھاری تیاری کا علم نہ تھا اور ہم نے اپنی غلطی سے اتنا نقصان اٹھایا لیکن تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم اتنا نقصان اٹھانے کے بعد خالی ہاتھ واپس چلے جائیں گے۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”ہمیں اس سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں کہ تم میں سے کوئی واپس نہ جا سکے۔“

مرہٹہ افسر نے کہا۔ ”میں اس حویلی کے مالک کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں!

“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”اس حویلی کا مالک ڈاکوؤں کے ساتھ بات کرنے کا عادی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ روپے کے عوض اپنی جانیں بچا سکتے ہو۔ “”تم نے ہماری جانوں کی قیمت بہت کم لگائی ہے۔اور ہمارے پاس روپوں کی بجائے گولیاں ہیں۔

”اچھی طرح سوچ لو!“

”تم جا سکتے ہو“

مرہٹہ افسر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”تم نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے، ہمارا لشکر شہر کے دوسرے محلوں میں مصروف ہے۔لیکن اگر ضرورت

پڑی تو ہم ان سب کو یہاں لے آئیں گے۔"

"یہ جگہ کافی کشادہ ہے اور یہاں تمھارے تمام لشکر کی لاشیں سما سکتی ہیں اور شاید تمھیں یہ معلوم نہیں جب وہ یہاں پہنچیں گے تو ان کے سامنے صرف تمھاری قبریں کھودنے کا کام ہوگا۔ ہم تمھیں آخری بار سوچنے کا موقع دیتے ہیں اس کے بعد تم مرشدآباد کے تمام خزانے ہمارے قدموں میں ڈھیر کرو گے تو بھی تمھاری بات نہیں سنی جائے گی۔

"تم ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہو، لیکن ہمارے پاس صرف گولیاں ہیں ۔تم جا سکتے۔ہم تمھارے حملے کا انتظار کرر ہے ہیں۔"

"اچھا تمھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

مرہٹہ افسر یہ کہہ کر مڑا اور سفید جھنڈی زمین پر پھینک کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکلا۔

تھوڑی دیر میں مرہٹوں نے آس پاس کے چند اونچے مکانات کی چھتوں سے فائرنگ شروع کر دی اور معظم علی کے ساتھی اس کے جواب میں حویلی کے رہائشی مکان کی چھت سے گولیاں برسانے لگے۔غروب آفتاب تک بندوقوں کی یہ لڑائی جاری رہی۔اس کے بعد مرہٹوں نے فائرنگ بند کر دی۔۔اس کی بیشتر آدمی ابھی تک حویلی کے بیرونی احاطے میں جمع تھے۔شام ہوتے ہی ان کے ساتھ چند دستے آملے۔معظم علی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ نئے حملے کیلیے رات کی تاریکی کا انتظار کر رہے ہیں اندرونی دیوار کے پیچھے مرہٹوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس نے خندق کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگایا۔شمالی دیوار کے قریب پہنچ کر اسے کچھ آہٹ سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ مرہٹے دیوار کے پیچھے زمین کھودنے میں

مصروف ہیں۔مشرقی دیوار کے قریب پہنچ کر بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔اس نے جلدی سے نیچے اتر کر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضا کاروں کو خبردار کیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی دیواریں گرانے کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر وہ نچلی منزل میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا، اور انھیں ہدایت کی کہ اب یہاں کسی عورت، بچے یا بیکار آدمی کو نہیں رہنا چاہیے۔وہ جن کے لیے بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہیں، چھت پر چلے جائیں۔اگر مرہٹے یہاں تک آ گئے تو تم میں سے ہر ایک کو اپنی بہنوں کے ناموس کی خاطر لڑنا پڑے گا۔تھوڑی دیر بعد رضا کار مشرقی اور شمالی دیوار کے سامنے ریت کی بوریوں کے نئے مورچے بنا رہے تھے۔

کوئی دس بجے کے قریب مرہٹوں نے جنوب اور مغرب کی سمت باہر کے مکانات کی چھتوں سے دوبارہ فائرنگ شروع کی۔معظم علی نے بھاگ کر میدان کے اندر اور باہر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضا کاروں کو یہ حکم دیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی طرف سے حملہ کرنے سے پہلے تمھاری توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہتا ہے تم اس فائرنگ کی پرواہ نہ کرو۔مکان کی چھت سے چند آدمی دشمن کی گولیوں کا جواب دیتے رہیں گے لیکن باقی سب کی توجہ اس طرف رہنی چاہیے۔رات کے گیارہ بجے کے قریب یکے بعد دیگرے چند دھماکے سنائی دیئے۔اور شمال اور مشرق کی دیواریں جن کی بنیادیں کھودی جا چکی تھیں کئی جگہ سے گر پڑیں۔دیواروں میں شگاف پڑنے کی دیر تھی کہ مرہٹوں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر دیا اندر سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔لیکن حملہ آور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق عبور کرنے کے بعد بانس کی باڑ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔وہ شدید نقصان اٹھانے کے بعد صحن

کے اندر اِدھر اُدھر پھیل گئے اور زمین پر رینگنے لگے۔اسی دوران مرہٹوں کی فوج کے ایک حصے نے براہ راست دروازے سے صحن پر یلغار کرنے کی کوشش کی لیکن رضا کاروں نے انھیں صحن کے درمیانی مورچوں کے قریب نہ آنے دیا۔توپوں سے پھر ایک بار کام لیا گیا اور مرہٹے بھاری، نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد لڑائی کا سارا زور شمال اور مشرق کی طرف تھا حملہ آوروں کے لیے رات کی تاریکی جس قدر فائدہ مند تھی اسی قدر نقصان دہ بھی تھی۔وہ دیواریں توڑنے کے بعد اچانک حملہ کر کے حویلی کے محافظوں کے سراسیمگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن رضا کاروں کی غیر متوقع مدافعت نے ان کے حوصلے پست کر دیئے۔تاریکی میں انھیں اپنے زخمی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی صحیح تعداد کا علم نہ تھا۔تاہم گولیوں کی بوچھاڑ میں زخمی ہونے والوں کی چیخیں ہر آن ان کی سراسیمگی میں اضافہ کر رہی تھیں۔چند آدمی راستے کے مورچے توڑنے کے بعد مکان کے قریب پہنچ گئے لیکن تلواروں، خنجروں اور لاٹھیوں سے مسلح آدمیوں کا ہجوم کمروں اور برآمدوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔چند مرہٹے مارے گئے اور باقی پیچھے ہٹ گئے۔تھوڑی دیر بعد چند حملہ آور مکان پر یلغار کرنے کی بجائے صحن کے درختوں کی آڑ لے کر اور باقی گری ہوئی دیواروں کے پیچھے چھپ کر فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے:۔

○

آدھی رات کو جب چاند نمودار ہو رہا تھا۔شہر کے مختلف گوشوں سے نقاروں کی صدائیں بلند ہونی لگیں اور مرہٹے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف سمٹنے لگے۔حویلی کے محافظ بندوقوں کے دھماکوں کی بجائے بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں کی آہٹ سن رہے تھے۔

معظم علی نے برآمدے کے سامنے سے باہر نکل کر بلند آواز میں کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے دشمن شہر خالی کر رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک چال ہو۔ تم اپنے مورچوں میں چوکس رہو اور میری ہدایات کا انتظار کرو میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔“

معظم علی تاریکی میں احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں چچا جان!“ معظم علی نے حسین بیگ کی آواز پہچان کر جواب دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرہٹوں نے اچانک گولہ باری کیوں بند کر دی؟“

”میرے خیال میں وہ واپس جا رہے ہیں۔ اور اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ میں ذرا چھت پر جا کر تسلی کر لوں۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

معظم علی کسی توقف کے بغیر زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پاؤں رکھتے ہی اسے ایک کونے سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ چھت پر حسین بیگ کے اپنے نوکروں کا پہرہ تھا اور وہ معظم علی کی ہدایات کے مطابق منڈیر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک چھت کے کونے میں کھڑا اطمینان سے بندوق بھر رہا تھا۔ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے غضب ناک ہو کر کہا بے وقوف اپنا سر نیچے رکھو!“

لیکن اس نے معظم علی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ہاتھ بندوق بھرنے میں مصروف تھے اور نگاہیں صحن میں آم کے درخت پر لگی ہوئی تھیں۔ معظم علی کو کسی رضا کار یا حسین بیگ کے نوکر سے حکم عدولی کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ

بندوق کا دھماکہ سنائی دیا اور گولی سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ معظم علی جلدی سے دبک کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اسے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن خودکشی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم گولی کا انتظار کرنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے نیچے چھلانگ لگا دو۔'' یہ کہہ کر معظم علی نے جلدی سے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر نیچے بیٹھا دیا۔

''یہ گولی سامنے کسی درخت سے آئی تھی؟'' معظم علی نے پوچھا۔

''ہاں''۔

''تم کون ہو؟''

اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر معظم علی نے کہا۔ ''تم فوراً نیچے چلی جاؤ۔ لڑکیوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور گھٹنوں کے بل صحن میں جھانکنے کے بعد اچانک ایک فائر کر دیا۔

معظم علی نے گردن اوپر کر کے صحن کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ ''تم ہوا میں فائر کر رہی ہو اور دیکھو گردن نیچے رکھو!''

لڑکی نے کہا۔ ''اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو میرا نشانہ خالی نہ جاتا۔ اب وہ دوسری شاخ پر جا چکا ہے۔ یہ میری بندوق بھر دیجئے۔ جلدی کیجئے وہ نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

"یہ لو۔ "معظم علی نے اپنی بندوق بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے دیکھ سکتی ہو؟ "

"ہاں۔ "لڑکی نے اٹھ کر نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے اپنا سر نیچے رکھو"۔ معظم علی نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں آخری بار آپ کی حکم عدولی کر رہی ہوں۔ "لڑکی نے یہ کہہ کر بندوق چلادی۔ صحن میں آم کے درخت سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی۔

معظم علی نے کہا۔ "اب تمھاری ضد پوری ہو چکی ہے۔ لیکن ایک مرہٹے کے لیے تمھیں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔ "

"وہاں ایک نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے دریچے سے چار آدمی درخت پر چڑھتے دیکھے تھے ایک کو میں نے وہیں سے فائر کر کے گرا لیا تھا۔ دو بھاگ گئے تھے۔ اور یہ چوتھا کمرے سے میرے نشانے کی زد میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے اوپر آنا پڑا۔"

معظم علی نے چاندنی کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی تھی اور گلہ میں بارود کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ معظم علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

معظم علی نے اپنے دل میں کوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا تم فرحت ہو؟"

لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے گالیاں دی ہیں۔"

"مجھے کسی سپاہی سے حکم عدولی کی توقع نہ تھی۔ اور تمھیں بلاوجہ جان خطرے میں ڈالنے سے منع کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اگر تم خفا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا

ہوں۔“

”میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔“

معظم علی نے کہا۔”اب تم اطمینان سے نیچے جا کر سو جاؤ، اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں، مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ گلی سے ان کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔“

چھت کے پہرے دار اٹھ اٹھ کر صحن کی طرف جھانکنے اور ایک دوسرے کو یہ خوش خبری سنانے لگے۔”مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔ مرہٹے بھاگ رہے ہیں!“

معظم علی نے بھری ہوئی بندوق فرحت کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی بندوق واپس لے لی اور کہا۔”اب شاید آپ کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

فرحت کچھ کہے بغیر زینے کی طرف چل دی اور معظم علی نے رضا کاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔”تم بہت غیر ذمہ دار ہو۔ اگر مرزا صاحب کی صاحب زادی اپنی بے احتیاطی کے باعث زخمی ہو جاتیں تو ہم انھیں کیا منہ دکھاتے؟“

حسین بیگ کے ایک نوکر نے کہا۔”جناب ان کے لباس سے دھوکہ ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی رضا کار ہے۔“

”لیکن کسی رضا کار کو بھی چھت پر کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تمھارا فرض تھا کہ تم انھیں بے احتیاطی سے منع کرتے!“

حسین بیگ کے نوکر نے جواب دیا۔”ہم نے انھیں منع کیا تھا۔ لیکن انھوں نے ہماری طرف توجہ دینے کی بجائے بندوق چلا دی۔ اتنی دیر میں آپ پہنچ گئے۔“

معظم علی نے اٹھ کر چھت کی چاروں طرف متوجہ ہو کر کہا۔”میرے خیال میں اب میدان خالی ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک مجھے حویلی کے باہر کے حالات کے

متعلق تسلی نہیں ہوتی تمھیں چوکس رہنا چاہیے ۔ہو سکتا ہے کہ ابھی تک چند آدمی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد معظم علی پندرہ رضا کاروں کے ساتھ اندرونی صحن کے طول و عرض میں چکر لگانے کے بعد باہر کے احاطے میں پہنچا۔حملہ آور رفو چکر ہو چکے تھے حویلی کے مختلف گوشوں میں دشمن کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں ۔اور جگہ جگہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں،مرہٹے،حسین بیگ کے اصطبل سے بیس گھوڑے اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

معظم علی رضا کاروں کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا ۔قریباً ایک گھنٹہ محلے کی گلیوں میں چکر لگانے کے بعد اس نے واپس آ کر اعلان کیا۔''مرہٹے جا چکے ہیں۔ خدا نے ہماری مدد کی ہے اب اس کی بارگاہ میں سجدوں کا وقت ہے۔''

عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی کے نعروں اور مسرت کے آنسوؤں سے اس کے اعلان کا خیر مقدم کر رہے تھے۔مکان کے اندر خواتین معظم علی کی ماں کے گرد جمع ہو کر تشکر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں اور مکان سے باہر مردوں کا ہجوم معظم علی کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔وہ ان کے لیے ایک قابل فخر بیٹا،ایک قابل عزت بھائی اور ایک قابل اعتماد دوست بن چکا تھا۔

معظم علی نے رضا کاروں کو مشعلیں جلانے کا حکم دیا اور برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہا۔''بھائیو! کمروں کے اندر خواتین اور بچے گرمی کے باعث سخت تکلیف میں ہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تمام مرد حویلی کے بیرونی احاطے میں چلے جائیں تا کہ ہماری بہنیں باقی رات کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مسلح رضا کاروں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ وہ صبح تک بیرونی فصیل کے مورچوں

میں پہرہ دیں ۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مرہٹے دوبارہ حملہ کریں گے تاہم میں نے احتیاط کے طور پر چند آدمیوں کو باہر کے راستوں پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا ہے ۔آپ کو رات کا کھانا نہیں ملا ۔مرزا صاحب نے اس بات کا ذمہ لیا ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ سب کے لیے دستر خوان بچھا دیئے جائیں گے :۔

:ــ ‘‘

چوتھا باب

صبح کی نماز کے بعد محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔
معظم علی تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر دیوان خانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو محمود علی، یوسف، حسین بیگ، آصف، اور افضل اس کی چارپائی کے گرد کھڑے مسکرا رہے تھے۔وہ جلدی سے اٹھ کر یکے بعد دیگرے اپنے باپ، بھائی اور دوستوں سے بغل گیر ہوا،

افضل نے کہا۔"معظم تم نے تو ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا!"

حسین بیگ بولا۔"بیٹا اگر مرہٹے ہمیں ایک دو ماہ اور مہلت دیتے تو معظم اس محلے کے ہر مکان کا نقشہ بدل دیتا۔"

محمود علی نے کہا۔"ہم راستے میں بہت پریشان تھے۔خدا کا شکر ہے کہ آپ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ورنہ یہ محلّہ بہت غیر محفوظ تھا۔"

حسین بیگ نے کہا۔"خدا کا شکر ہے کہ اب محلے کے لوگ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر معظم کا قیاس غلط ثابت ہوا تو مجھے اس شہر سے ہجرت کرنا پڑے گی، سلطان خان نے میرا مذاق اڑانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔لیکن جب مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سارے شہر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں آ گیا تھا۔رات کے وقت وہ میرے کتب خانے میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔لوگ تاریکی میں اسے ٹھوکریں مارتے تھے۔لیکن وہ اف تک نہیں کرتا تھا۔"

معظم علی نے سوال کیا۔"چچا جان! آپ نے شہر کے حالات معلوم کیئے ہیں؟

‘‘

حسین بیگ نے جواب دیا۔ ’’شہر میں مرہٹوں نے کافی لوٹ مار کی ہے۔ جگت سیٹھ کے محل سے وہ بیس لاکھ روپیہ نکال کر لے گئے ہیں اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم شہیدوں کے جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد شام کے چار بجے تھے تمھیں میر مدن کے پاس جانا ہے۔‘‘

’’میر مدن کے پاس؟‘‘

’’ہاں تم سو رہے تھے انھوں نے تمھیں جگانے کی اجازت نہیں دی۔‘‘

’’وہ یہاں آئے تھے؟‘‘

’’ہاں وہ آئے تھے اور حویلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ ان کے ساتھ فوج کے چند اور افسر بھی تھے۔ وہ تمھاری کارگزاری پر بہت خوش تھے۔‘‘

معظم علی نے سوال کیا۔ ’’انھیں آپ نے یہاں بلایا تھا؟‘‘

حسین بیگ نے جواب دیا ’’بیٹا انھیں یہاں آنے کے لیے کسی کے بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے یہ خبر کافی تھی کہ اس حویلی میں دو سو مرہٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔‘‘

محمود علی نے کہا۔ ’’راستے میں ہماری طرح میر مدن بھی اس محلے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کی حویلی بہت غیر محفوظ ہے۔ لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی جب ہمیں مرہٹوں کے نقصان کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا کہ میں سب سے پہلے مرزا صاحب کی حویلی دیکھنا چاہتا ہوں:۔

○

شام کے چار بجے معظم علی شاہی محل کی چاردیواری کے اندر میر مدن کے مکان

میں داخل ہوا۔ایک سپاہی اسے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک نوجوان افسر کے پاس لے گیا۔

"تشریف رکھیئے!" افسر نے اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

معظم علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام معظم علی ہے اور مجھے میر صاحب نے بلایا ہے۔"

افسر چونک کر کرسی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ محمود علی کے صاحب زادے ہیں معاف کیجئے۔میں آپ کو بڑی عمر کا آدمی سمجھتا تھا۔میر صاحب چند افسروں سے بات چیت کررہے ہیں۔آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی افسر سے مصافحہ کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔چند ثانیے خاموشی سے معظم علی کی طرف دیکھنے کے بعد افسر نے کہا:

"میرا نام گوہر خان ہے۔آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!۔"

تھوڑی دیر بعد فوج کے چند افسروں کو دیوان خانے کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گوہر خان نے کہا:

"چلیے اب وہ فارغ ہوگئے ہیں۔"

معظم علی، گوہر خان کے پیچھے ہولیا۔صحن عبور کرنے کے بعد وہ دیوان خانے کے برآمدے میں داخل ہوئے اور گوہر خان معظم علی کو رکنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہوا۔

سطوت وجبروت کا ایک پیکر مجسم کرسی سے اٹھ کر دو تین قدم آگے بڑھا اور

معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں انتظار کرنا پڑا میں بہت مصروف تھا۔''

''مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔''

''بیٹھ جاؤ!''

معظم علی میر مدن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میر مدن نے کہا۔''میں تمھاری کارگزاری دیکھ چکا ہوں اور مجھے تم پر فخر ہے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''معظم علی نے احسان مندی سے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ بنگال کی فوج کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔مرزا حسین بیگ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمھیں فوج کی ملازمت پسند نہیں۔ میں سیاست دان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں تمام کارآمد نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کرلوں۔ محلے کی حفاظت کے سلسلے میں تمھاری کارگزاری دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمھارے سیاسی نظریات چاہے کچھ ہوں۔موجودہ حالات میں تم بنگال کی فوج کے لیے اپنی خدمات کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکو گے۔مرہٹوں کے ساتھ گذشتہ لڑائیوں میں میرے چند بہترین سالار شہید ہو چکے ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ ان میں سے ایک کی جگہ اسی وقت پر کردی جائے۔ آج تک میں نے عہدوں کی تقسیم کے لیے کسی کی سفارش قبول نہیں کی۔لیکن تمھارا معاملہ مختلف ہے۔''

معظم علی نے پریشان ہو کہا۔''اگر مرزا صاحب نے میری سفارش کی ہے تو

مجھے بہت افسوس ہے۔میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔"

میر مدن نے مسکراتے ہوئے کہا۔"برخوردار! مرزا حسین بیگ نے نہیں بلکہ ان کی حویلی میں پڑی ہوئی دو سو مرہٹوں کی لاشوں نے تمھاری سفارش کی ہے۔پھر جب میں تمھارے محلے کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو بچوں اور بوڑھوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مجھے یہ پیغام دے رہے تھے کہ اس محلے میں ایک نوجوان ایسا ہے جس کی جرأت، ہمت، اور ذہانت پر تم اعتماد کر سکتے ہو۔"

معظم علی نے کہا۔"لیکن میں نے صرف ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔یہ کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں۔"

"تم نے ایک چھوٹی ضرورت کو پورا کیا ہے۔اب میں تمھیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے کی دعوت دے رہا ہوں۔"

معظم علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔"اگر یہ دعوت کسی اور کی طرف سے ہوتی تو میں سوچے بغیر انکار کر دیتا لیکن آپ کے سامنے بات کرنا بھی میرے نزدیک گستاخی ہے۔"

"تمھیں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"میر مدن نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔جب وہ فارغ ہوا تو معظم علی نے کہا۔"میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔میرے تذبذب اور پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس قیادت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو قوم کے اجتماعی تقاضوں کی بجائے اپنی ضروریات کے مطابق دوستوں اور دشمنوں کے متعلق اپنا زاویہ نگاہ بدلتی رہتی ہے۔"

میر مدن نے لکھا ہوا کاغذ معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"سپاہی ہمیشہ سیاست دانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔اور تم ایک سپاہی ہو۔میں بنگال

کی فوج کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو قوم کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ موقع ہمیشہ موقع پرست سیاست دانوں کے ذہن سے سوچتے ہیں اور تمھارے جیسے حقیقت پسند اور فرض شناس نوجوانوں کے تعاون کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہیکہ تم کسی دن فوج کے سپاہیوں میں وہ اجتماعی ضمیر بیدار کرسکو گے۔ جو سیاسی طالع آزماؤں کی کوتاہیاں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ تمھاری تقرری کا حکم نامہ ہے میں تمھیں دو دن سوچنے کا موقع دیتا ہوں اگر تم نے دو دن کے بعد فوج میں حاضری نہ دی تو یہ حکم نامہ خود بخود منسوخ ہو جائے گا۔ اور مجھے اس بات کا افسوس ہوگا کہ میں ایک مضبوط پتھر کو قوم کے دفاعی حصار کی تعمیر کے لیے کام میں نہ لا سکا۔ مرشد آباد میں اب کچھ عرصہ حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جنوب مغربی اضلاع کے لیے خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ میر حبیب سے زیادہ ہماری کمزوریوں سے کوئی واقف نہیں۔ وہ مرشد آباد میں اپنی ناکامی کا بدلہ لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔''

معظم علی نے کہا۔''میں جانتا ہوں کہ اس وقت، بردوان ،میدناپور اور ہگلی کے علاقے خطے میں ہیں اور اگر میں ایک سپاہی ہوں تو مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی ضرورت نہیں میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں۔ میں کل ہی اپنے دستے کی کمان سنبھال لوں گا'':

○

علی وردی خان مرشد آباد میں اپنی افواج کو از سر نو منظم کر رہا تھا کہ مرہٹہ فوج نے میر حبیب کی قیادت میں اچانک ہگلی کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ برسات کی وجہ سے مرشد آباد سے رسدو کمک کے راستے بند ہو چکے تھے اور مرہٹے کسی موثر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر بردوان ،میدناپور اور باسر کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ اور

چند ہفتوں میں حالت یہ ہوگئی کہ مرشد آباد کے جنوب مغرب میں کوئی علاقہ مرہٹوں کے حملوں کی زد سے محفوظ نہ تھا۔

برسات کی شدت کم ہوتے ہی علی وردی خاں نے پوری تیاری کے ساتھ مرشد آباد سے پیش قدمی کی اور کٹوے کے قریب دریائے بھاگرتی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریباً اکتیس دن فریقین اپنے اپنے کیمپوں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ اودھ کا صوبہ دار اپنے لشکر کے ساتھ علی وردی خاں کی مدد کے لیے آ رہا ہے چنانچہ انھوں نے ایک گھمسان کی جنگ پسپائی اختیار کی چند دنوں میں علی وردی خاں کی افواج نے مرہٹوں کو بردوان، ہگلی اور میدنا پور کے علاقوں سے نکال دیا۔ ہر محاذ سے مرہٹوں کی عام پسپائی شروع ہو چکی تھی اور بنگالی فوج کے تیز رفتار ہراول دستے ان کی افراتفری سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

معظم علی ہراول دستوں کے ان چند افسروں میں سے ایک تھا جو پورے لشکر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ دشمن کے تعاقب میں یہ لوگ باقی فوج سے ہمیشہ ایک منزل آگے رہتے تھے۔ مرہٹہ فوج کئی کئی کوس بھاگنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالتی۔ لیکن یہ لوگ اچانک حملہ کر کے ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ معظم علی کی کمان میں پانچ سو سوار تھے اور وہ چند دنوں میں دشمن کی پچیس توپوں اور سامان رسد کی ستر گاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ علی وردی خاں نے اڑیسہ کی سرحد تک، مرہٹوں کا تعاقب کیا۔ ایک شام بنگال کی افواج نے جھیل چھلکا کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور علی وردی خاں نے افسروں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ یہ ہماری آخری منزل ہے۔ اب اس سے آگے جانا بے سود ہے۔''

رات کے وقت جب فوج فتح کا جشن منا رہی تھی ۔میر مدن، علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔’’عالی جاہ! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہراول فوج کے ایک سالار نے واپس آنے کی بجائے یہاں سے کوئی چودہ میل دور دشمن کے ایک قلعہ پر حملہ کر دیا ہے۔‘‘

علی وردی خاں نے برہم ہو کر کہا۔’’یہ میرے حکم کی خلاف ورزی ہے۔میں نے تمام فوج کو یہاں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔وہ سالار کون ہے؟‘‘

’’عالی جاہ وہ معظم علی ہے۔‘‘

’’لیکن ہراول فوج کو سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی!!‘‘

’’عالی جاہ اس نے سرحد عبور نہیں کی۔یہ قلعہ ہمارا تھا اور مرہٹے چند سال سے اس پر قابض چلے آتے ہیں۔‘‘

اور وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پانچ سو سپاہی مرہٹوں کے تمام لشکر کو موت کی گھاٹ اتار کر قلعے پر قابض ہو جائیں گے؟‘‘

’’عالی جاہ! میرے خیال میں وہ اب تک قلعہ پر قابض ہو چکا ہوگا۔جو اطلاع مجھے ملی ہے اس کے مطابق وہ ہراول کے باقی دستوں سے کٹ کر مرہتوں کے لشکر سے آگے نکل گیا تھا۔اس کا یہ مقصد تھا کہ مرہتوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے ۔اب مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسے کمک نہ بھیجی گئی تو مرہٹوں کا لشکر وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لے گا اور ہماری فوج کے پانچ سو بہترین سپاہی مارے جائیں گے۔‘‘

علی وردی خاں نے کہا۔’’اگر صورت یہ تھی تو تمھیں کمک بھیج کر میرے پاس آنا چاہیئے تھا۔‘‘

میر مدن مسکرایا" عالی جاہ میں فوج کو تیاری کا حکم دے آیا ہوں۔صرف آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

"کتنے سپاہی لے جا رہے ہو؟

"پانچ ہزار"

"جاؤ!"

جب میر مدن خیمے سے باہر نکل رہا تھا تو علی وردی خاں نے کہا:

انشاءاللہ کل ہم وہ قلعہ دیکھنے آئیں گے":۔

○

میر مدن کا قیاس درست تھا، معظم علی غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکا تھا قلعے کی حفاظت کرنے والے پچاس سپاہیوں میں سے چوبیس ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔پندرہ گرفتار اور باقی ایک چور دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔

معظم علی نے قلعے کے برج پر بنگال کا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سے کہا:"بہادرو! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔لیکن آج رات تمھیں شاید آرام نصیب نہ ہو۔مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر تک مرہٹوں کا لشکر یہاں پہنچ جائے گا۔لیکن اگر ہم صبح تک قلعے پر قبضہ رکھ سکے تو انشاءاللہ ہماری فوج پہنچ جائے گی اور ہمارے مقدر میں ایک اور شاندار فتح ہو گی۔لیکن اگر ہم نے ہمت ہار دی اور مرہٹے دوبارہ قلعے پر قابض ہو گئے تو ہمارے لیے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔قلعے میں اتنا بارود ہے کہ ہم چند گھنٹے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔رات کے وقت ہمیں فصیل کے ہر حصے پر چوکس رہنا چاہیے۔"

مرہٹہ فوج کے سرداروں کو اس بات کا یقین تھا کہ علی وردی خاں کا لشکر ان کا مزید تعاقب نہیں کرے گا اور وہ سرحدی قلعہ میں پناہ لے کر اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکیں گے۔لیکن کوئی دو کوس کے فاصلے پر قلعے سے فرار ہونے والے سپاہیوں نے انھیں خبر دی کہ بنگال کے مٹھی بھر سپاہی قلعہ پر قابض ہو چکے ہیں ۔مرہٹہ سردار کے محافظوں کو بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیتے ہوئے آگے بڑھے اور آدھی رات کے قریب انھوں نے قلعے سے کوئی آدھ میل دور شمال کی جانب پڑاؤ ڈال دیا۔اس کے بعد میر حبیب اپنے پانچ ہزار آزمودہ کار سپاہی لے کر آگے بڑھا اور اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

پچھلے پہر شدید گولہ باری کے بعد مرہٹوں کا لشکر چاروں طرف سے قلعے پر یلغار کر رہا تھا اور معظم علی کے ساتھی کمک پہنچنے کی امید پر اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔اچانک جنوب مشرق کی سمت سے گولیوں کی بارش ہونے لگی اور مرہٹہ فوج میں افراتفری پھیل گئی۔وہ مغرب کی طرف سمٹنے لگے۔تھوڑی دیر بعد مغرب کی طرف سے بھی درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے مرہٹوں پر گولیاں برسنے لگیں اور کوئی آدھ گھنٹے بعد مرہٹے انتہائی انتشار کی حالت میں شمال کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میر مدن نے اپنے سواروں کو عام حملے کا حکم دیا اور آن کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔بنگال کی فوج پڑاؤ تک مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آ گئی۔

صبح کے دھندلکے میں معظم علی اور اس کے ساتھی قلعے سے باہر نکل کر میر مدن کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

میر مدن کے دائیں بائیں محمود علی، یوسف، آصف اور افضل بیگ اپنے اپنے

گھوڑوں پر سوار تھے۔میر مدن نے دروازے کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا۔"تمھیں اس قلعے پر حملہ کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟"

یہ سوال اور یہ لب ولہجہ معظم علی کے لیے غیر متوقع تھا۔وہ ایک ثانیہ کے لیے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں میر مدن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے باپ، بھائی اور دوستوں کی طرف دیکھا۔وہ سب مسکرا رہے تھے۔معظم علی نے اپنے دل میں خوش گوار دھڑکنیں محسوس کیں۔

"بولتے کیوں نہیں؟"میر مدن نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا۔"اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے مجھے کسی نئے حکم کی ضرورت نہ تھی۔میرا یہ اقدام آپ کی منشا کے عین مطابق تھا۔"

میر مدن نے مڑ کر محمود علی کی طرف دیکھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"لیکن تمھارے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔انھیں آرام کی ضرورت تھی۔"

ایسے حالات میں سپاہی کے لیے گھوڑے کی زین بستر سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہے پھر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قلعہ ان کے سفر کی آخری منزل ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جی بھر کر آرام کر سکیں گے۔"

میر مدن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا۔معظم علی تمھارا یہ کارنامہ میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن تم نے ہمیں آرام کی دعوت نہیں دی؟"

معظم علی نے جواب دیا۔"اندر چلیئے، میں نے آپ سب کے لیے آرام کا انتظام کر رکھا ہے"۔:

○

دوپہر کے وقت قلعے سے باہر ایک کشادہ خیمے کے اندر علی وردی خاں کا دربار لگا ہوا تھا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا اور وہ بنگال کے حکمران کو سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔

علی وردی خاں نے گاؤ تکیے کا سہارا چھوڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"نوجوان! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "عالی جاہ! مجھے یقین تھا کہ چند گھنٹے اس قلعے پر قبضہ رکھ سکتا ہوں اور اتنی دیر میں سپہ سالار کمک بھیج دیں گے۔"

"لیکن کمک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟"

"عالی جاہ! میں نے یکے بعد دیگرے آٹھ سوار پڑاؤ کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور میر مدن کی موجودگی میں کمک کے دیر سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"رات کے وقت اس قلعے کی طرف تمھاری رہنمائی کرنے والا کون تھا؟"

"مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس علاقے کا ہر نشیب و فراز اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔"

علی خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نوجوان! میں تمھیں اس قلعے کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔ اگر تمھارے متعلق میر مدن کے خیالات صحیح ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "عالی جاہ! میں میر مدن کی توقعات پوری کرنے کی

کوشش کروں گا۔‘‘

چوتھے روز معظم علی اس قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں بنگال کے لشکر کو الوداع کہہ رہا تھا۔ قلعے کے قریب ایک بلند ٹیلے سے بنگال کی افواج کی آخری جھلک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پانچ سو سپاہیوں کو قلعے کی چار دیواری کے اندر جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے سامنے تقریر کی:۔

میرے ساتھیو! تم مجھے مغموم نظر آتے ہو۔ ہم اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور پھینک دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک بہت بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قلعہ بنگال کی ایک دورافتادہ چوکی نہیں بلکہ مرشد آباد کے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس ویرانے میں رہ کر اپنے گھروں کی حفاظت کریں گے جو یہاں سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور ہمیں یہ تسکین ہوگی کہ ہماری وجہ سے ہماری قوم کے لاکھوں افراد آرام کی نیند سوتے ہیں۔

میر مدن نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس قلعے کو مستحکم بنانے کے لیے وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے اور میں ان کے ساتھ یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے، اس قلعے پر بنگال کا پرچم لہراتا رہے گا۔ یہ قلعہ بہت اہم ہے اور ہمیں اسے ناقابل تسخیر بنانا ہے۔‘‘

اگلے دن معظم علی کے سپاہی اس قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی مرمت کا کام شروع کر چکے تھے۔

ایک سال بعد کٹک کا فوج دار اس قلعے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے علی وردی خاں کو یہ خط لکھا:۔

''ایک سال بعد یہ قلعہ دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں ۔ معظم علی نے اس کا نقشہ بدل دیا ہے ۔ٹوٹی ہوئی فصیل کی جگہ ایک نئ فصیل تعمیر ہو چکی ہے ۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش کے لیے نئ کوٹھڑیاں تعمیر کی جارہی ہیں ۔اور فصیل سے باہر خندق کھودنے کا کام شروع ہو چکا ہے، اس قلعے کی تعمیر نو کے لیے جو رقم منظور کی گئ تھی وہ بہت قلیل تھی اور معظم علی نے اخراجات بچانے کے لیے تعمیر اور مرمت کا بیشتر کام اپنے سپاہیوں سے لیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معظم علی کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو دفاعی لحاظ سے ہمارا یہ سرحدی قلعہ بہت مضبوط بن جائے گا۔

اس قلعے کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کے علاوہ معظم علی نے اردگرد کے جنگلات مرہٹہ ڈاکوؤں سے پاک کر دیئے ہیں اور سرحد کی اجڑی ہوئی بستیاں دوبارہ آباد ہو رہی ہیں، ان بستیوں کی حفاظت کے لیے مقامی رضا کاروں کی فوج منظم کی جارہی ہے اور اب تک معظم علی کے سپاہی قریباً ایک ہزار آدمیوں کو فوجی تربیت دے چکے ہیں ۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق معظم علی سے کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو تمھیں مرشد آباد تبدیل کیا جا سکتا ہے، میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا۔لیکن اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ ابھی اس علاقے میں ازسر نو آباد ہونے والے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور یہ جذبہ صرف معظم علی میں ہی نہیں بلکہ اس کا ہر سپاہی یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے:۔

پانچواں باب

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔سرحدی قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں معظم علی کی زندگی کا کوئی ایک لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ مرشد آباد کے متعلق نہیں سوچتا تھا کبھی وہ بچپن کے ان ایام کا تصور کرتا۔ جب وہ یوسف، افضل اور آصف بیگ کے ساتھ اپنے محلے کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔کبھی اسے والدین کا خیال آتا اور اسے قلعے کی فضائیں اداس محسوس ہونے لگتیں۔بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کی تصویریں ایک ایک کرکے اس کے سامنے آتیں۔اور بالآخر مرشد آباد کے متعلق اس کے تمام تصورات ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتے ایک ایسی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی جس کے کوئی مستقل خدوخال اس کے ذہن پر نقش نہ تھے اور اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینوں سے لبریز ہو جاتی۔وہ رات کے وقت کھلی فضا میں لیٹے لیٹے کبھی بلند آواز میں اور کبھی دبی زبان سے فرحت کا نام پکارتا اور کائنات کی وسعتیں ستاروں کے نغموں سے لبریز ہو جائیں۔لیکن پھر اچانک تصورات کے یہ سنہرے تار ٹوٹ جاتے اور وہ گہری نیند سو جاتا۔

ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس نے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ زندگی کی کسی منزل میں فرحت اور اس کا رستہ ایک ہو سکتا ہے۔ تاہم فرحت کے متعلق موہوم، دل کش اور دل فریب تصورات اس کے خیالوں اور سپنوں کی دنیا پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔مرزا حسین بیگ، آصف اور افضل بیگ کے نام اس کے ہر خط کی آخری سطر پر ''سندگان حال کو سلام'' کے الفاظ پر ختم ہوتی تھی اور یہی ایک جملہ اس کے نزدیک تمام خط سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔آصف کو خط کا

جواب لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن افضل اور حسین بیگ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کے خطوط کا جواب دیا کرتے تھے حسین بیگ کے خطوط میں ایک پدرانہ شفقت کا اظہار ہوتا ۔افضل کے خطوط بنگال کے سیاسی صورت حالات کت تذکروں سے لبریز ہوتے ۔کبھی کبھی وہ ایک آدھ فقرہ اپنی بہن کے متعلق بھی لکھ دیتا اور معظم علی اسے پڑھ کر اپنے دل میں خوش گوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتا ۔فرحت اچھی ہے تمھیں سلام کہتی ہے ۔آج فرحت کہتی تھی تمھاری امی جان بہت مغموم رہتی ہیں، اس لیے تمھیں چند دن کے لیے گھر ضرور آنا چاہیے اور معظم علی کا جی چاہتا کہ وہ اڑ کر مرشدآباد پہنچ جائے۔

اپنی والدہ کے نام خط لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ احساس کارفرما ہوتا کہ وہ اس کی وساطت سے فرحت کے ساتھ باتیں کر رہا ہے ۔معظم علی کی ماں اپنے خطوط میں فرحت کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا کرتی تھی ۔اگر کسی خط میں فرحت کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور وہ جواب میں شکایت کرتا ۔''امی جان آپ نے مرزا حسین بیگ اور انکے بال بچوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی!'' اور ماں کی طرف سے اس قسم کا جواب آتا ۔''بیٹا میں تمھارا خط ملتے ہی ان کے ہاں گئی تھی ۔وہ سب بخریت ہیں، فرحت بہت خوش ہے، وہ تمھارے متعلق پوچھتی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتی ہے تمھارے متعلق پوچھا کرتی ہے ۔پچھلے دنوں میں علیل تھی اور وہ ہر روز میری تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی ۔بڑی نیک لڑکی ہے، وہ پوچھتی تھی کہ تم چند دن کی چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آجاتے؟'':

○

علی وردی خاں ایک بیدار مغز حکمران تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں سلطنت بنگال ایسے سیاسی شاطروں کی آماجگاہ بن چکی تھی جو قوم کی عزت و آزادی کو ہر وقت داؤں پر لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مسند اقتدار کے یہ بے حیا دعویدار کبھی کسی صوبے دار یا فوج دار کے ساتھ ساز باز کرتے، اسے علی وردی خاں کے مقابلے میں لے آتے اور کبھی مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے پر اکساتے۔ علی وردی خاں کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جو بنگال کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں رہتے تھے بنگال کے اندر حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور فوجی افسر اور بنگال سے باہر مرہٹہ لٹیروں کے لشکر ایسے لوگوں کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوتے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سیاست رائے عامہ کے محاسبہ سے قطعاً آزاد تھی۔ علی وردی خاں کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی بیرونی حملہ آوروں سے مقابلہ کرتا، جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کے حدود میں آ گھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خاں کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار کو فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکے۔ لیکن اپنے تدبر، ذہانت اور موقع شناسی کے باوجود وہ ان فتنوں کا سدباب نہ کر سکا جو بالآخر اس کے جان نشین نواب

سراج الدولہ کی شکست اور بنگال کی تباہی کا باعث ہوئے۔ ان کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ بیرونی خطرات کے مقابلے کے لیے ملک کے عوام کا مدافعانہ شعور اور اندرونی غداروں کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار نہ کرسکا۔

علی وردی خاں کے دربار میں میر جعفر کے عروج کیساتھ بنگال کی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکے تھے۔ وہ ان قسمت آزماؤں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھا۔ جو سلطنت کے عہدیداروں کے گٹھ جوڑ یا مرہٹوں کے تعاون سے بنگال کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اور اس کی دور اندیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے مستقبل ان انگریز تاجروں کے ساتھ وابستہ کرلیا۔ جو فورٹ ولیم میں بیٹھ کر نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔

میر جعفر کا طریق کار ان طالع آزماؤں سے مختلف تھا جو کھلے بندوں علی وردی خاں کے ساتھ قوت آزمائی کر کے اپنی شکست یا تباہی کا خطرہ مول لیتے تھے۔ وہ در پردہ ان تمام بغاوتوں اور سازشوں میں شریک تھا جو بتدریج بنگال کی قوت مدافعت کو مفلوج کر کے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔

یکے بعد دیگرے بنگال کے امراء کی بغاوتوں نے اس کے راستے صاف کر دیئے۔ علی وردی خاں جو عام حالات میں میر جعفر کو اپنا ایک حقیر ساتھی سمجھتا تھا، یہاں تک مجبور ہو گیا کہ اسے قابل اعتماد دوست سمجھنے لگا اور یہ ایک حقیقت پسند انسان کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس سیاست دان کی مجبوری تھی جو برائیوں کو ختم کرنے سے ناامید ہوکر ان سے اچھے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میر جعفر اڑیسہ کا نائب صوبے دار مقرر ہوا تو مرشد آباد کیا امراء جو اسے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتے تھے، چونک اٹھے ن اس نے جلد ہی ایک اور کامیابی حاصل کی، یعنی ہگلی اور میدنا پور کی

فوج داری بھی حاصل کر لی، ہو سکتا ہے کہ دربار میں اپنے ایک رشتہ داروں کی سازشوں سے تنگ آ کر اسے علی وردی خاں نے اسے مرشد آباد سے دور بھیجنا مناسب خیال کیا ہو۔لیکن بنگال کے سن رسیدہ حکمران کو کیا معلوم تھا کہ ہگلی میں ایک فوج داری کی حیثیت سے میر جعفر کا اثر و رسوخ بنگال کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہو گا ۔ہگلی اور رمید ناپور میں علی وردی خاں کی نگاہوں سے دور رہ کر وہ زیادہ آزادی کے ساتھ انگریزوں کی سازشوں میں شریک ہو سکتا تھا:۔

O

اڑیسہ پر مرہٹوں اور افغانوں کی متحدہ حملے کی خبریں مشہور ہو رہی تھیں ۔ایک دن مرشد آباد کے پریشان حال لوگوں نے سنا کہ ہگلی سے میر جعفر کی کمان میں سات ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوج کٹک کا رخ کر رہی ہے ۔پھر کوئی ایک ہفتہ بعد اطلاع آئی کہ میر جعفر دشمن کو شکست دینے کے بعد ان کا تعاقب کر رہا ہے ۔

پھر جب مرشد آباد میں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، یہ خبر آئی کہ حملہ آوروں کی مدد کے لیے راگھو جی کا بیٹا جانو جی ایک ٹڈی دل لشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے اور میر جعفر اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے الٹے پاؤں بردوان کی طرف بھاگ رہا ہے اس کے بعد کئی دن اڑیسہ کے طول و عرض میں مرہٹوں اور افغانوں کی لوٹ مار کی خبریں آتی رہیں، معظم علی کے دوست اور عزیز ان خبروں سے بہت پریشان تھے ۔کسی کو معلوم نہ تھا کہ دور افتادہ سرحدی کا یہ محافظ کس حال میں ہے ۔ مرزا حسین بیگ ہر روز سپہ سالاروں کے پاس جاتا اور معظم علی کے متعلق پوچھتا لیکن کئی دن تک وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا ۔فرحت اور اس کی والدہ صبح شام معظم علی کے گھر جاتیں اور اس کی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتیں ۔

چند دن بعد کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ مرہٹوں نے سرحدی قلعہ فتح کر لیا ہے۔ معظم علی کے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں اور باقی دشمن کی قید میں ہیں اور اس قسم کی افواہوں کے ساتھ معظم علی کی بہادرانہ موت کی فرضی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔

ایک دن فرحت اور اس کی والدہ حسب معمول معظم علی کے گھر گئیں۔ کچھ دیر معظم علی کی ماں سے باتیں کرنے کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ معظم علی کی ماں انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ وہ زنان خانے سے نکل کر مکان کے مردانہ حصے کے صحن میں داخل ہو رہی تھیں کہ گلی کی طرف سے ایک سوار اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"معظم!" ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ کچھ دیر تینوں سکتے کے عالم میں کھڑی رہیں۔

معظم علی گھوڑے سے اترا اور اسلام علیکم" کہہ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں فرحت جس کے چہرے پر اب تک کئی رنگ آ چکے تھے۔ اپنی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"معظم! معظم!!" ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر معظم علی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا "بیٹا! یہ تمھاری چچی جان ہیں!"

حسین بیگ کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بیٹی تم گھر جاؤ اور اپنے ابا سے کہو کہ معظم علی آ گیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

فرحت اپنا چہرہ چادر میں چھپائے ہوئے جھجکتی اور سمٹتی دروازے کی طرف

بڑھی۔

معظم علی نے کہا۔ ''چچی جان آپ کے گھر میں خریت ہے نا؟''

فرحت کی ماں نے جواب دیا۔ ''گھر میں سب خریت ہی بیٹا،لیکن تم نے ہم کو بہت پریشان کیا۔''

صابر! صابر!''معظم علی کی ماں نے نوکر کو آواز دی۔

صابر آنکھیں ملتا ہوا اصطبل کے قریب کمرے سے باہر نکلا اور خواتین کی موجودگی کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا۔

معظم علی کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''صابر معظم علی کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دو اور اس کے ابا جان اور یوسف کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو۔''

معظم علی نے کہا۔ ''نہیں امی جان گھوڑا باندھنے کی ضرورت نہیں،ابھی مجھے باہر کچھ کام ہے۔''

فرحت کی ماں نے کہا۔ ''بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ آرام سے گھر بیٹھو،تمھارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دن سے آرام نہیں کیا ہے۔''

معظم علی نے کہا چچی جان! میں میر مدن کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے ملاقات کے بعد شاید نواب صاحب کے سامنے حاضر ہونا پڑے۔ مجھے سیدھا وہاں جانا چاہیے تھا۔لیکن میں نے سوچا کہ پہلے گھر کا حال معلوم کرلوں''۔

○

کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی، میر مدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔میر مدن نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھانے کے بعد کہا۔ ''معظم علی میں کسی تمہید کے بغیر تمھارے

ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں“

معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”میرے ساتھی میر جعفر کی بزدلی اور بے غیرتی کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اور میں مرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت کی بے حسی اور نا اہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شوہر ہلاک ہو چکے ہیں۔“

”اور باقی؟“ میر مدن نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ ”چالیس سپاہی دشمن کی قید میں ہیں اور باقی ایک سو ساٹھ، جن میں سے قریباً پچاس زخمی ہیں، قلعے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ میں انھیں بردوان کے راستے میں ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہم نے دشمن کے ہاتھوں شکست نہیں کھائی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت نے ہمیں بے دست و پا بنا کر دشمن کے آگے ڈال دیا تھا۔ ہم نے پندرہ دن تک دشمن کے اس لشکر کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ہم سے بیس گنا زیادہ تھا اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر کمک پہنچ جائے گی۔ میں ہر روز میر جعفر کے پاس پیغام بھیجتا تھا کہ ہمارا بارود ختم ہو رہا ہے اور ہم زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن پندرہ دن کے بعد جواب ملا کہ اس قلعے کی حفاظت بے سود ہے تم اگر دشمن کا محاصرہ توڑ کر نکل سکتے ہو تو بردوان پہنچ جاؤ۔

اگر یہی حکم ہمیں آٹھ دس دن پہلے مل جاتا تو اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔ میر جعفر کی نا اہلیت اور بزدلی کے باعث ہمارے ہاتھ سے صرف ایک قلعہ ہی نہیں نکلا بلکہ اڑیسہ کے تمام علاقوں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر حکومت نے کچھ عرصہ اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہے کہ پورا

بنگال مرہٹوں کی شکارگاہ بن جائے گا۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان حالات میں بھی میر جعفر سے چند منٹ کی ملاقات کے لیے دو دن بردوان میں ٹھہرنا پڑا۔"

"تم میر جعفر سے مل کر آئے ہو؟"

"ہاں! دو دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں زبردستی محل کے اندر گھس گیا اور سپاہی مجھے پکڑ کر اس کے سامنے لے گئے تھے۔"

میر مدن نے کہا۔ "معظم علی! جعفر اپنی تمام برائیوں کے باوجود بنگال کے حکمران کا رشتہ دار ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر کسی بزدل آدمی کو بزدل کہنا گستاخی ہے تو میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں علی وردی خاں کے سامنے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میر جعفر ان کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اس قابل نہیں کہ اسے فوج میں کوئی معمولی عہدہ بھی دیا جا سکے۔"

میر مدن نے چند ثانیے سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ "معظم علی! میں بھی ایک سپاہی ہوں اور موجودہ حالات میں تمھارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ میر جعفر کے متعلق میرے خیالات تمھارے خیالات سے مختلف نہیں لیکن علی وردی خاں کے سامنے اس کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب اسے میدنا پور اور ہگلی کی فوج داریدی جا رہی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی، میں نے علی وردی خاں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان کے لیے اس کا انتخاب درست نہیں ۔لیکن میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھیں میر جعفر کی صلاحیتوں کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں لیکن بڑے بڑے امراء کی بغاوتوں نے انھیں میر جعفر جیسے

خوشامدیوں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔تم انکے سامنے اس میر جعفر کی شکایت کرو گے جس کی نا اہلیت اور بزدلی کے باعث اڑیسہ کے عوام تباہی کا سامنا کر رہے ہیں ۔لیکن جب میر جعفر ان کے سامنے پیش ہوگا تو انتہائی غصہ کی حالت میں بنگال کے حکمران کا معاملہ اس شخص کے ساتھ ہوگا جو بوقت ضرورت اپنے آقا کے قدموں میں گرنا جانتا ہے،وہ کہے گا۔''عالی جاہ! میں آپ کا حقیر غلام ہوں۔میں خطاؤں کا پتلا ہوں۔میری تقصیر معاف کیجئے۔''تو علی وردی خاں اگر اس کے الفاظ سے نہیں تو اس کے آنسوؤں سے ضرور متاثر ہوگا اور جب میر جعفر دیکھے گا کہ اس کے آنسو بھی رائگاں گئے ہیں تو وہ محل کی بیگمات کے پاس جائے گا اور ان سے کہے گا کہ نواب صاحبمیرے دشمنوں کی باتوں میں آ گئے ہیں۔میں مظلوم ہوں میں بے گناہ ہوں۔ خدا کے لیے میری سفارش کیجئے۔سلطنت کے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ یہ وفادار غلام نواب صاحب کے قدموں میں رہے۔''اور پھر چند دن بعد نواب صاحب اسے بلا کر یہ کہیں گے۔''میر جعفر! ہم تمھارے سابقہ فروگذاشتیں معاف کرتے ہیں۔لیکن آئندہ کے لیےمحتاط رہو۔ہمیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔''اور یہ کہے گا۔''عالی جاہ مجھے جاہ ومنصب کا شوق نہیں۔مجھے کم ازکم اس وقت تک اپنی خدمت کا موقع دیجیے، جب تک سراج الدولہ سلطنت کے کاروبار میں آپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور ایسے امراء بنگال سے ختم نہیں ہو جاتے جو آئے دن آپ کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں معظم علی! مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے بردوان میں میر جعفر سے یہ ضرور کہا ہوگا کہ تم علی وردی خاں کے پاس جا کر اس کی شکایت کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے میر جعفر کے جاسوس،علی وردی خاں کو اس کا یہ پیغام پہنچا چکے ہوں گے کہ ایک سرپھرا نوجوان شاید آپ کے

پاس پہنچ کر میری شکایت کرے، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور یہ نوجوان آپ کے متعلق بھی نہایت باغیانہ خیالات کا ظہار کر چکا ہے۔"مرشدآباد میں شاہی محل کے اندر اور باہر اس کے جاسوس ہر وقت چوکس رہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ تمھارے مرشدآباد پہنچنے سے پہلے تمھارے متعلق اس کی ہدایات ان کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔اب میرے ساتھ ملاقات کے بعد تم اگر علی وردی خاں کے پاس جا کر میر جعفر کی شکایت کرو گے تو ایسے لوگ انھیں فوراً خبردار کریں گے کہ تم میری طرف سے آئے ہو۔"

معظم علی نے بددل ہو کر کہا۔"مجھے معلوم نہ تھا کہ میر جعفر کے سامنے آپ بھی بےبس ہو چکے ہیں۔"

میر مدن نے جواب دیا۔"معظم علی ہم نے برے حالات میں جنم لیا ہے۔ لیکن کاش ہم تمام برائیوں کے خلاف لڑ سکتے۔موجودہ حالات میں نواب علی وردی خاں بھی یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ بیک وقت ہر برائی کیخلاف نہیں لڑ سکتے۔وہ ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے خطرات کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔اس وقت ان کی ساری توجہ مرہٹوں پر مرکوز ہے۔میرے مشورہ پر اب انھوں نے اڑیسہ کی مہم میر جعفر کی جگہ عطاء اللہ خاں کو سونپ دی ہے، وہ دو دن تک یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔آج تیسرے پہر علی وردی خاں نے فوج کے چند افسروں کا اجلاس طلب کیا ہے۔اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم میر جعفر کیخلاف اپنے جذبات پر قابو رکھو گے تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اجلاس میں تمھیں بھی بلا لیا جائے تم تمام حالات سے واقف ہو اور اس اجلاس میں میر جعفر کی ذات کے متعلق کچھ کہے بغیر تمھیں پوری آزادی ہے ان غلطیوں پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت ہو گی جن کے

باعث یہ حالات پیدا ہوئے ہیں۔میر جعفر کی احمقانہ پسپائی کے متعلق ایک ہفتہ قبل بھرے دربار میں کافی لے دے چکی ہے اور تم اس کی ذات کو ہدف ملامت بنا کر علی وردی خاں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔لیکن اگر تم گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے کوئی مفید تجویز پیش کر سکو تو ممکن ہے کہ اڑیسہ کے حالات کے رو بہ اصلاح ہوتے ہی وہ وقت بہت جلد آ جائے جب ہم اطمینان سے میر جعفر کے قماش کے لوگوں پر توجہ دے سکیں۔"

معظم علی نے کہا۔"میری پہلی تجویز یہ ہوگی کہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں میر جعفر جیسے لوگوں کو فوجی معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جائے۔"

میر مدن مسکرایا۔"تمھیں یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔میر جعفر کو یہ ہدایات بھیجی جا چکی ہیں کہ وہ عطا اللہ خاں کے ساتھ پورا تعاون کرے اور عطا اللہ خاں کو یہ اختیار دیا جا چکا ہے کہ اگر وہ کسی افسر سے مطمئن نہ ہو تو اسے سبکدوش کر دے۔"

معظم علی نے کہا۔"جب مرہٹے ہمارے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور مجھے کئی دن تک میر جعفر کی طرف سے اپنے پیغامات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں اپنے ساتھیوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ کر وہاں سے نکلنے لگا تو میں نے یہ عہد کیا کہ میں کم از کم ایک بار اور یہاں ضرور آؤں گا۔میں عطا اللہ خاں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا،لیکن اگر آپ کو اس کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے تو میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔"

میر مدن نے کہا۔"۔"لیکن میرا خیال تھا کہ تم اتنی مدت کے بعد مرشد آباد

رہنا چاہو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔"وہ قلعہ جہاں میرے ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مجھے مرشد آباد سے زیادہ عزیز ہے۔":۔

○

میر مدن سے ملاقات کے بعد معظم علی واپس گھر پہنچا تو اس کا باپ، بھائی اور حسین بیگ دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پندرہ بیس آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے، وہ سب باری باری اٹھ کر اس سے بغل گیر ہوئے۔

مرزا حسین بیگ نے معظم علی کو اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔"بیٹا ہم بڑی دیر سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں اور تمھاری زبان سے اڑیسہ کے حالات سننے کے لیے بے چین ہیں۔ جن دنوں سے سرحدی علاقوں کے متعلق بری خبریں آ رہی تھیں اور ہم تمھارے متعلق بہت پریشان تھے، ہمیں تمام واقعات سناؤ!۔"

معظم علی نے اس کے جواب میں میر جعفر کی نا اہلیت، مرہٹوں کے مظالم اور سرحدی قلعے کی تباہی کی داستان مختصراً بیان کر دی۔

اتنی دیر میں محلے کے بوڑھے، بچے، اور جوان جوق در جوق مکان کے اندر داخل ہو رہے تھے اور صابر بلند آواز سے چلا رہا تھا۔"بھئی ٹھہرو اندر جگہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے شور نہ مچاؤ اندر مرزا صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔"

معظم علی جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا اور لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ بڑھ کر اس کے ساتھ بغل گیر ہونے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود علی، حسین بیگ اور محلے کے باقی معززین بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گئے اور برآمدے میں کھڑے ہو کر یہ تماشہ دیکھنے لگے۔

جب معظم علی صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے کے بعد ڈیوڑھی میں پہنچا تو باہر گلی میں ایک اور ہجوم دکھائی دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ ان لوگوں سے ملنے میں مصروف رہا۔

اتنی دیر میں آصف بیگ اور افضل بیگ بھی آ گئے، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے اور معظم علی دیوان خانے کی بجائے بالائی منزل کے کمرے میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اگلے دن سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ معظم علی، عطاللہ خاں کے ساتھ اڑیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس کے بھائی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹوں نے بھی اس مہم کے لیے اپنے نام پیش کیے تھے لیکن مرشد آباد کے فوج دار نے صرف آصف بیگ کو معظم علی کا ساتھ دینے کی اجازت دی ہے۔

تیسرے دن مرزا حسین بیگ کے ہاں معظم علی کی دعوت تھی، جس میں مرشد آباد کے قریباً ساٹھ امراء اور بڑے بڑے افسر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب مرزا حسین بیگ محلے کے چند معززین کے ساتھ ڈیوڑھی سے باہر کھڑا تھا اور اس کے محل کے اندر وسیع سائبان کے نیچے جمع ہونے والوں کی نگاہیں اندرونی صحن کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک نوعمر لڑکا، جس کے دائیں بائیں میر مدن، راجہ رام، موہن لال، عطاللہ خان اور مرشد آباد کے فوج دار تھے۔ دروازے سے نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے مرزا حسین بیگ اور محلے کے چند اور معززین تھے۔ نوعمر خوش وضع لڑکا، جس کی قبا ہیروں سے مرصع تھی، ایک شاہانہ تمکنت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور سائبان کے نیچے جمع ہونے والے مہمان اٹھ کر کھڑے ہو

گئے یہ کم سن لڑکا سلطنت بنگال کا ولی عہد سراج الدولہ تھا۔وہ کسی کے ساتھ بے تکلفی سے مصافحہ کرتا اور کسی کو ہاتھ کے اشارے یا مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور دستر خوان پر بیٹھ گیا۔کھانے کے دوران میں مہمان سراج الدولہ کے بعد جس شخص کی طرف سب سے زیادہ دیکھ رہے تھے وہ معظم علی تھا جو اس کے بائیں ہاتھ عطا اللہ خاں اور حسین بیگ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسین بیگ اٹھا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر میں سراج الدولہ، میر مدن اور دوسرے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سراج الدولہ نے اس تقریر کے جواب میں کہا۔"اس وقت ہم سب کو معظم علی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔جس کی خاطر اس شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ہمارے لیے اس سے بڑی اور خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ ہمیں اس نوجوان کی عزت افزائی کا موقع ملا جس نے بنگال کی فوج کے لیے جرأت، ہمت، بہادری اور وفاداری کی قابل فخر مثال قائم کی ہے۔میری دلی خواہش ہے کہ جب اڑیسہ کی مہم سے مرشد آباد کی فوج واپس آئے تو مرزا صاحب اسی طرح کی کئی اور دعوتوں کی ضرورت محسوس کریں"۔:

-

○

بنگال کی فوج اڑیسہ میں مرہٹوں کو پے در پے شکست دینے کے بعد انھیں مغرب کی طرف دھکیل رہی تھی۔سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر عطاءاللہ خاں کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔۔ایک شام معظم علی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑاؤ میں داخل ہوا اور گھوڑے سے اترتے ہی سیدھا سپہ سالار کے خیمے میں پہنچا۔

عطا اللہ خان اپنے کاتب سے کوئی مراسلہ لکھوا رہا تھا۔اس نے معظم علی کی

طرف دیکھتے ہی کہا۔میں دو دن نے سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔تم نے بہت دیر لگائی

۔

معظم علی نے جواب دیا میں مرہٹوں کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شمال کے تمام جنگلات ان کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔پھر بھی اگر پانچ سو قیدیوں کو ساتھ لانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں دو دن قبل یہاں پہنچ جاتا۔قیدیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحد قلعے میں اس وقت مرہٹوں کے صرف ایک ہزار سپاہی موجود ہیں۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی تاخیر کے بغیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔

عطاءاللہ خان نے جواب دیا۔قلعے پر حملہ کرنے کے لیے تمہیں چند دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔کل مجھے یہ اطلاع ملی تھ کہ یہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف مرہٹوں کا یک لشکر جنگل میں پڑاوٗ ڈالے ہوئے ہے اور آج علی الصباح میر جعفر کی قیادت میں پانچ ہزار سواروں کو اس طرح روانہ کر چکا ہوں۔

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا۔میر جعفر کو ایسی مہم پر بھیجنے سے پہلے اگر آپ دشمن کو غیر مسلح کر کے درختوں کیس اتھ باندھ دیتے تو شاید مہم کامیاب رہتی۔

عطاءاللہ خان نے جواب دیا۔میر جعفر اس مہم پر جانے کے لیے مصر تھا اور اسے گذشتہ بدنامی کا داغ دھونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔تمہارا دوست آصف بیک میر جعفر کے ساتھ جا چکل ہے۔اور مجھے میر جعفر سے زیادہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔میں اس مہم پر تمھیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن تم دیر سے پہنچے ہو۔

معظم علی نے کہا۔میر جعفر کی رفاقت کے لیے آصف بیگ جسے جری نوجوان کا انتخاب صحیح نہیں تھا۔میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے

اور میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آنے کی بجائے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔

عطاء اللہ خان نے جواب دیا اگر تمہیں میر جعفر کی کمان میں لڑنے پر کوئی اعتراض نہیں تو میں خوشی سے تمہارے درخواست منظور کرتا ہوں۔

معظم علی نے کہا میں ایک سپاہی ہوں اور اگر میر جعفر نے کوئی بہت بڑی حماقت نہ کی تو ہمارے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

عطاء اللہ خان نے ایک نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ یہ مرہٹوں کا پڑاؤ ہے۔اور میں نے میر جعفر کو یہ راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔کل طلوع آفتاب سے پہلے ہو دشمن پر حملہ کر دے گا۔ میرے خیال میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں تازہ دم سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ میں تمھارے لیے پانچ سو سواروں کی تیاری کا حکم دیتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنی رہنمائی کے لیے اس نقشے کی نقل تیار کر لو۔

معظم علی نے جواب دیا۔ یہ نقشہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ یہ دیکھیے مرہٹوں کے پڑاؤ سے صرف تیس ۳۰ میل دور وہ قلعہ ہے۔ جہاں میں کئی برس گذار چکا ہوں۔ ان جنگلوں میں میں نے بار بار مرہٹوں کا تعاقب کیا ہے۔ مرہٹوں کے پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلے وادیاں اور ندیاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ شاید حملے سے پہلے نہ پہنچ سکوں۔

عطاء اللہ خان نے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے۔

معظم علی سپہ سالار کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور قریباً نصف گھنٹہ بعد اس کی قیادت میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رخ کر رہے تھے۔

○

اگلی صبح چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد معظم علی کو اپنے سامنے ایک ندی کے کنارے خیموں کی ایک قطار دکھائی دی۔ مسلح سپاہیوں کی چند ٹولیاں ان خیموں کے درمیان اِدھر اُدھر گشت کر رہی تھیں ۔وہ گھوڑا بھگاتا ہوا سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچا۔ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔معظم علی نے کسی توقف کے بغیر سوال کیا۔تم نے رات کے وقت یہاں پڑاؤ ڈالا تھا؟

جی ہاں!

"فوج کو یہاں سے روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"کوئی ڈیڑھ گھنٹہ"

"رات کے وقت دشمن کی نقل وحرکت کے متعلق کوئی اطلاع ملی تھی؟"

جی ہاں! رات کے وقت ہمیں پتہ چلا تھا کہ دشمن یہاں سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

اور وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے ہیں؟

جی ہاں! اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی تھی کہ جنگل میں فوج کو اس سے آگے پیدل پیش قدمی کرنی چاہیے یا گھوڑوں پر۔آصف بیگ کا خیال تھا کہ فوج کو اس سے آگے پیدل جانا چاہیے۔لیکن میر جعفر یہ کہتے تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

معظم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔میر جعفر یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے کے لیے پاؤں کی بجائے گھوڑے زیادہ کام دیتے ہیں۔پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔تم میں سے پچاس آدمی میرے ساتھ پیدل چلیں اور دوسو اس ندی کے کنارے

درختوں اور پتھروں کی آڑ میں مورچے بنالیں۔باقی تمام گھوڑوں کو لے کر ان ٹیلوں کی پیچھے چھپ جائیں مجھے یقین ہے کہ میر جعفر دشمن کو بہت جلد یہاں لے آئیں گے۔

پھر وہ پڑاؤ کے محافظ کی طرف متوجہ ہوا۔میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں سے یہ خیمے اکھاڑلو اور رسد کا ضروری سامان ان ٹیلوں کے پیچھے لے جاؤ۔

نوجوان افسر نے گھبرا کر کہا۔لیکن جناب !میر جعفر کے حکم کے بغیر۔۔۔۔۔؟

معظم علی نے جھنجھلا کر کہا۔اگر تم نے رات کے وقت اس جگہ پڑاؤ ڈالا تو مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر بعد میر جعفر کو حکم دینے کا ہوش نہیں ہوگا اور میں اس کے سامنے تمھیں حکم عدولی کی سزا دے سکوں گا۔

لیکن جناب میں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی۔میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میر جعفر !معظم علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں دس منت کے بعد اس جگہ پڑاؤ کا نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔

بہت اچھا جناب!

اچانک جنگل میں دور سے بندوق کے دھماکے سنائی دیئے اور معظم علی نے گھوڑے سے کود کر اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا۔بہادرو! جلدی کرو،میر جعفر میری توقع سے پہلے واپس تشریف لا رہے ہیں۔

پچاس سپاہی گھوڑوں سے اتر کر معظم علی کے پیچھے ندی میں گھس پڑے اور گھٹنے گھٹنے پانی میں سے گزرنے کے بعد جنگل میں غائب ہوگئے،کوئی ایک میل جنگل میں چلنے کے بعد انہیں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔معظم علی نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ اس کے دائیں بائیں بکھر کر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہوگئے۔چند

منٹ بعد بنگالی فوج کے چند سوار دکھائی دیئے جن میں سے ایک میر جعفر تھا۔

ٹھریئے! ٹھریئے!! معظم نے دونوں ہاتھ بلند کر کے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتے ہوئے نکل گئے۔ پھر چند دستے نمودار ہوئے۔ ایک افسر نے معظم علی کو دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے سوال۔ کیا ہوا۔ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ ہماری بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آ چکی ہے۔

معظم علی نے چلا کر کہا۔ لیکن تم بھاگ کیوں رہے ہو؟

یہ میر جعفر کا حکم ہے۔

مرزا آصف بیگ کہاں ہے؟

وہ حملے کے وقت اپنی ایک ہزار فوج کے ساتھ گھوڑوں کے اتر کر جنگل میں گھس گیا تھا اور اب معلوم نہیں اس کا انجام کے اہو گا؟ میر جعفر اس سے بہت خفا ہیں

۔

معظم علی نے کہا۔ اگر آصف کے ایک ہزار جانباز ابھی تک جنگل میں ہیں تو مرہٹے کھلے میدان میں تم سے لڑنے کیلئے نہیں آ ہیں گے۔ تم تمام سواروں کو اس جگہ روکنے کی کوشش کرو، میں جوابی حملہ کرنا چاہتا ہوں۔

افسر نے جواب دیا۔ لیکن میر جعفر اسے حکم عدولی سمجھیں گے۔

معظم علی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ میر جعفر مرشد آباد پہنچے سے پہلے دم نہیں لیں گے۔ اور تم اس وقت میری کمان میں ہو۔ اگر کسی سوار نے آگے جانے کی کوشش کی تو میں اپنے سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ وہ اسے بلا توقف گولی مار دیں۔

افسر نے کہا۔ اگر آپ یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو میں بھاگنے کی بجائے آپ کی رفاقت میں جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں

اتنی دیر میں کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پھیل کر پیچھے آنے والے ساتھیوں کو روکنے لگے اور تھوڑی دیر میں چار ہزار سپاہی وہاں جمع ہو گئے۔ معظم علی نے آٹھ سو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے گھوڑے ندی کی پار لے جائیں اور باقی فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے جنگل میں پیش قدمی شروع کر دی۔ راستے میں سپاہیوں کے چند اور منتشر دستے اس کے ساتھ ملتے گئے۔ جنگل میں چند مقامات پر مرہٹوں کے اکا دکا دوستوں کیساتھ ان کا تصادم ہوا لیکن وہ معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ نکلے۔

کوئی دو گھنٹے بعد انہیں ایک طرف بندوقوں کے دھماکے اور لڑنے والوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک نصف دائرہ میں آگے بڑھے معظم علی کو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا ٹیلے کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سے جھیل دکھائی دی۔ جس کے کناروں پر آصف بیگ کے سپاہیوں اور مرہٹوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ آن کی آن میں وہ ٹیلے سے نیچے اتر کی اپنی فوج کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔

تھوڑی درے بعد بنگال کا لشکر دائیں اور بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر جھیل کے گرد گھیرا ڈالنے کے بعد مرہٹوں پر حملہ کر چکا تھا۔ مرہٹوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ حملہ جس قدر شدید تھا۔ اسی قدر غیر متوقع تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معظم علی کے سپاہی جھیل کے اردگرد دشمن کی لاشوں کے انبار لگا چکے تھے اور مرہٹے انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر

بھاگ رہے تھے۔

قریباً چالیس منٹ کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔شکست خوردہ دشمن کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی جو بدحواسی کی حالت میں جھیل میں کودنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹاپو پر جمع ہو گئے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ بنگال کے ڈیڑھ سو سپاہی زخمی اور اسی شہید ہوئے۔آصف بیگ جس کا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔چند سپاہی اور افسر اس کے گرد کھڑے تھے۔معظم علی بھاگتا ہوا پہنچا اور آصف کے قریب بیٹھ گیا۔

آصف نے اس کی طرف دیکھا ور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا دوست تم ذرا دیر سے آئے۔

معظم علی نے اردگرد کھڑے ہونے والے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ جراح کو بلاؤ جلدی کرو۔

آصف بیگ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ جراح کی ضرورت نہیں! تم اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے یہاں آنے کی توقع نہ تھی۔اور میں تھوڑی دیر پہلے سوچ رہا تھا کہ کئی باتیں ایسی تھیں جو میں تم سے نہیں کہہ سکا۔پھر اس نے اردگرد جمع ہونے والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

معظم علی! آصف نے قدرے توقف کے بعد کہا۔مجھے اسی جگہ دفن کر دینا اور ابا جان سے یہ کہنا کہ میں نے تمام زخم سینے پر کھائے تھے۔افضل کو میری طرف سے نصیحت کرنا کہ وہ کبھی کسی بزدل آدمی کی قیادت میں لڑنے کی غلطی نہ کرے۔ میں اپنی فوج کے سپاہی تمھیں سونپتا ہوں۔اور میرے جو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔

ان کے لواحقین کے لیے حکومت سے اعانت حاصل کرنا تمھارا فرض ہے۔میری خواہش ہے کہ تم کسی دن اڑیسہ کے گورنر بنو اور پھر میری قبر پر آ کر یہ کہو آصف! میں تمہیں بھولا نہیں۔ابا جان کی یہ خواہش تھی کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی کر دی جائے۔رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آج ہی ڈھاکہ کے کسی اونچے گھرانے سے میرے لیے پیغام آیا ہے۔تمھارے متعلق میرے دل میں ایک خواہش تھی لیکن کاش میں یہاں آنے سے پہلے ابا جان کو کچھ بتا سکتا۔معظم علی! تمہیں ایک بھائی کے منہ سے ایسی بات عجیب معلوم ہوں گی۔لیکن اب تمہیں شاید یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہ ہو، کہ میں اپنے دل میں فرحت کا مستقبل تمہارے ساتھ وابستہ کر چکا تھا۔معظم! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔امی جان کسی اور جگہ اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔لیکن مجھے اس کے دل کا حال معلوم تھا اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ابا جان کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔لیکن اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہوا تو انہیں اتنا ضرور بتا دینا کہ فرحت کے متعلق میری خواہش یہ تھی۔یہ باتیں میں اس لیے کہی ہیں کہ فرحت کا دل کا حال مجھے معلوم ہے۔وہ تمہیں چاہتی ہے جب تم اڑیسہ کے محاذ پر جا رہے تھے اس کے آنسو مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھے۔اس سے پہلے میں نے اپنی ننھی بہن کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔

آصف نے یہاں تک کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

معظم علی نے ایک سپاہی کو پانی لانے کیلئے کہا اور اس نے اپنی چھاگل کھول کر آگے کر دی۔معظم علی نے آصف کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا۔اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

آصف بیگ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نحیف آواز میں کہا۔ میں محسوس کرتا ہوں میں اپنی زندگی کا آخری فرض پورا کر چکا ہوں۔

کوئی ایک گھنٹہ تک آصف کی یہ حالت رہی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتا اور معظم علی سے چند باتیں کرنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیتا۔

معظم علی میں یہ بات کرنے یا ہلنے کی طاقت نہ تھی وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔فوج کے سپاہی انکے گرد سر جھکائے کھڑے تھے۔آصف بیگ نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور آسمان کی نیلگوں فضاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبتی آواز میں ابا جان۔ امی جان، افضل اور فرحت کے الفاظ چند بار دہرائے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

معظم علی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔پھر کچھ دیر اس کے سینے کے ساتھ کان لگانے کے بغیر انا للہ وانا علیہ راجعون کہہ کر اس کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں سے اُبلتے ہوئے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ان سب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔اور جنگل کی خاموش فضا میں ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم علی شہیدوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور میر جعفر کو لڑائی کے واقعات کیا اطلاع دینے کے لیے ایک افسر اور چند سپاہی روانہ کر دیئے۔

○

ندی کے کنارے میر جعفر بڑی بے چینی کے ساتھ فوج کا انتظار کر رہا تھا۔وہ معظم علی کو دیکھتے ہوی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔نوجوان تمھارا یہ اقدام میری خواہش کے مطابق نہ تھا۔میری خواہش یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ کھلے

میدان میں جنگ کی جائے ۔لیکن میں تمہیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں۔

معظم علی نے جواب دیا۔مرہٹوں کو آپ کے تعاقب کے لیے کھلے میدان میں آنے کی ضرورت نہ تھی۔بالخصوص اس حالت میں جب کہ وہ آصف بیگ کے ایک ہزار سپاہیوں پر اپنی تلواروں کی تیزی آزما سکتے تھے۔

میر جعفر نے کہا۔مجھے آصف بیگ کی موت کا افسوس ہے۔لیکن اگر وہ میری حکم عدولی نہ کرتا تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی۔

لیکن اگر آپ بھی اس کی طرح جان دینا پسند کرتے تو یہ صورتِ حالات پیدا نہ ہوتی۔

میر جعفر کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔لیکن اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی۔

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چند کوس دور ایک قلعے پر حملے کی اجازت دی جائے۔

کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم پہلے پڑاؤ میں جا کر اس مہم کے لیے عطاءاللہ کی اجازت حاصل کرلو۔

میں عطاءاللہ خان سے اجازت لے چکا ہوں۔مجھے صرف آپ کے سپاہیوں کی ضرورت ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اس جنگل سے شکست کھا کر بھاگنے کے بعد مرہٹے اس قلعے کا رخ کریں گے۔اس لیے میں کسی تاخیر کے بغیر پیش قدمی کرنا چاہتا ہوں۔

میر جعفر نے کہا۔میں اس مہم میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

لیکن اس چھوٹی سی مہم کیلئے آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں میں یہ چاہتا

ہوں کہ آپ مجھے اپنی فوج کے ڈیڑھ ہزار سپاہی ساتھ لے جانے کی اجازت دیں۔

نہیں۔میں خود بھی چلوں گا۔

بہت اچھا! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مرزا حسین بیگ کو آصف کی موت کی اطلاع دینے کے لیے کوئی ایلچی راونہ کردیں۔

اس کا انتظام ہو جائے گا۔اب بتاؤ ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے؟

ابھی اسی وقت! معظم علی نے جواب دیا۔

○

اگلے دن غروب آفتاب سے قبل بنگال کی فوج کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکی تھی۔میر جعفر کی حیثیت اس مہم میں ایک خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔اور فوج کی کمان عملاً معظم علی کے ہاتھ میں تھی۔لیکن فتح کے بعد وہ عطاء اللہ خان اڑیسہ کے صوبیدار، میر مدن اور علی وردی خان کے نام اس قسم کے خطوط لکھ رہا تھا۔

خدا نے ہمیں بڑی فتح دی ہے۔ہم نے اڑیسہ کی سرحد پر مرہٹوں کا سب سے بڑا مستقر چھین لیا ہے۔اب مجھے امید ہے کہ دشمن ایک مدت تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔

علی وردی خان کے نام اس کے خط کے آخری فقرے یہ تھے۔اس حقیر غلام نے اپنی بساط کے مطابق حضور پرنور کے حکم کی تعمیل کی ہے۔اب میرے سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرشد آباد پہنچ کر حضور کی قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔ اور حضور کو یہ خوشخبری سناؤں کہ اڑیسہ کی سرزمین دشمن کے وجود سے پاک ہو چکی ہے

۔

تیسرے دن عطاء اللہ خان باقی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے کوئی دو ہفتے قلعے میں قیام کیا۔ اس عرصے میں اسے شمال مغرب کی سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی تازہ حملوں کی خبر ملی اور اس نے معظم علی کو دو ہزار سپاہیوں کی ساتھ کوچ کا حکم دیا۔

دس دن بعد معظم علی واپس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شمال مغرب کے سرحدی علاقے مرہٹوں کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ عطاء اللہ خان نے معظم علی کو قلعے کی حفاظت پر متعین کر کے کمک کی طرف کوچ کیا۔

تین ماہ کے بعد معظم علی نے دو مہینے کی چھٹی لی اور مرشد آباد روانہ ہوا۔

○

ایک روز دوپہر کے وقت مرزا حسین بیگ بخار کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اس کی بیوی، افضل اور فرحت اس کے بستر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ افضل جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ فرحت برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم وا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، افضل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا حسین بیگ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل کی والدہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا چچا جان۔ چچی جان! مجھے افسوس ہے کہ میں آخری منزل تک آصف کا ساتھ نہ دے سکا۔

بیٹھ جاؤ بیٹا! حسین بیگ نے اس کی طرف پدرانہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔وہ بیٹھ گیا کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالآخر حسین بیگ نے مہر سکوت توڑی۔ معظم! میں اس کی قبر دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا،لیکن بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ رہا۔مجھے تمہارا خط ملا تھا۔لیکن میری خواہش تھی کہ اس شہادت کے تمام واقعات تمہاری زبانی سنوں۔

معظم علی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کر دیئے۔جب وہ آصف کی موت کی تفصیلات سنا رہا تھا۔تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ فرحت کے متعلق وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ آخری لمحات میں آصف بار بار اپنی بہن کو یاد کرتا تھا۔

اس کے بعد معظم علی صبح شام حسین بیگ کی تیمارداری کے لیے جاتا اور کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھا رہتا۔مرشد آباد میں اس نے ابھی کوئی بیس دن گذارے تھے کہ اسے میر مدن نے اپنے پاس بلایا اور کہا۔معظم علی! سرحد کے حالات ٹھیک نہیں۔مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا ہے اور جاسوسوں نے علی وردی خاں کو اطلاع دی ہے کہ عطاء اللہ خاں اور میر جعفر کٹک میں بیٹھ کر حکومت کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً سرحدی قلعے میں پہنچ جاؤ۔اور اس بات کا خیال رکھو کہ یہ لوگ مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز نہ کر سکیں۔

اگر حالات ایسے ہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا۔

میر مدن نے میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔یہ تمھارے نئے عہدہ کے متعلق علی وردی خاں کا حکم نامہ ہے تمہیں اڑیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت میں سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا ہے۔تمھاری کمان میں

مستقل طور پر دو ہزار سپاہی دیئے گئے ہیں۔اور کٹک کے صوبیدار کو یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ سرحد پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے کے لیے سرکاری خزانہ سے مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔آج تمھارے لیے کوچ کی تیاری کرنا مشکل ہو گا۔اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کل صبح تڑکے روانہ ہو جاؤ۔عطاء اللہ خاں کو یہ حکم بھیج دیا جائے گا کہ وہ مزید ایک ہزار سپاہی تمھاری کمان میں دے دے۔

میر مدن سے ملاقات کے بعد معظم علی اپنے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

معظم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔امی جان !میرے چھٹی منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح یہاں سے جا رہا ہوں۔

ماں پریشان ہو کر کہا۔بیٹا تمہیں کسی خطرناک مہم پر تو نہیں بھیجا جا رہا ہے۔

نہیں امی جان! مجھے اڑیسہ کی سرحدی اضلاع کا نائب فوجدار مقرر کیا گیا ہے

۔

نائب فوجدار؟ ماں نے چونک کر سوال کیا۔

ہاں امی جان! کیا آپ کے خیال میں نائب فوجدار بہت بڑا ہوتا ہے؟

نہیں بیٹا! میں تو دعا کیا کرتی ہوں کہ تم کسی دن بنگال کی فوج کے سپہ سالار بنو۔تمھارے ابا جان یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے،ہاں میں تمھیں ایک بات بتانا بھول گئی تھی۔آصف کی موت کی خبر آنے سے پہلے ڈھاکہ کا کوئی بہت بڑا رئیس،جو مرزا حسین بیگ کا رشتہ مانگتے تھے۔حسین بیگ کی بیوی کی یہی خواہش تھی کی فرحت کی منگنی وہاں کر کی جائے لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب آصف واپس آئے گا۔تو میں اس کے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا،اور لڑکے کو دیکھ کر فیصلہ کروں

گا بیٹا! میں کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ فرحت میری بہو بنے گی لیکن ایک دن میں نے تمھارے ابا سے ذکر کیا تو وہ مجھ پر برس پڑے کہنے لگے، معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے نکلوانا چاہتی ہو۔ مرزا صاحب کا یہ احسان تھوڑا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس قدر مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ تمھیں معلوم نہیں کہ وہ خاندان جس نے فرحت کا رشتہ مانگا ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو گاؤں کا ملک ہے، پھر ہامرے اگر کوئی حیثیت ہوتی بھی تو مرزا حسین بیگ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی برادری سے باہر لڑکی کا رشتہ کریں گے۔ اگر تمہارے ابا جان منع نہ کرتے تو میں شاید فرحت کی ماں سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھتی۔ فرحت بہت اچھی لڑکی ہے۔ اور میرے زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ میری بہو بنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہاری ترقی کے لیے بہت دعا کیا کرتی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے فرحت کے متعلق اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رکھا ہوا اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہوں جب تم اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اونچے خاندان کے لڑکوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکو۔ ورنہ فرحت کے لیے لکھنوء کے ایک بہت بڑے گھرانے کا رشتہ بھی آتا تھا اور مرزا صاحب نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

امی جان!

کیا ہے بیٹا؟

کچھ نہیں امی جان۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے آپ کو بھائی یوسف کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔

ماں نے جواب دیا۔ یوسف کے لیے تین رشتے آئے ہیں لیکن وہ تینوں لڑکیاں مجھے پسند نہیں۔ عبداللہ خان کی لڑکی مجھے پسند تھی۔ لیکن وہ یہاں سے کلکتہ جا

چکے ہیں۔تمھارے ابا جان نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔مگر انہیں فرصت نہیں ملی ۔پچھلے مہینے ان کا خط آیا تھا کہ وہ اس سال حج کے لیے جا رہے ہیں ۔جب وہ حج سے واپس آئیں گے تو میں تمھارے ابا جان کو ضرور بھیجوں گی ۔

معظم علی کچھ خاموش بیٹھا رہا۔اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کہاں جا رہے؟ماں نے پوچھا۔

مرزا صاحب کے پاس ۔

دروازے کے قریب پہنچ کر معظم علی نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

امی جان!سچ بتایئے آپ کو فرحت بہت پسند ہے؟

ہاں بیٹا!

لیکن امی جان میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا

جھوٹا کہیں کا۔ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔اور معظم علی ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

چھٹا باب

عطاء اللہ خان کٹک کے قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا معظم علی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

عطاء اللہ خان نے کہا۔ مجھے کل ہی تمہارے متعلق حکم ملا تھا۔ میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا نیا عہدہ اڑیسہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟

اگر فوج تیار ہے تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

فوج کے لیے چند دن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جو دستے تمہاری کمان میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ بردوان اور میدنا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں آج ہی انہیں حکم بھیجتا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔ سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کا تازہ سرگرمیوں کے پیش نظر میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سپاہیوں کو وہاں سے سیدھا سرحدی قلعے میں پہنچنے کا حکم بھیج دیں۔ میں کل علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

بہت اچھا۔ میں ابھی انہیں حکم بھیج دیتا ہوں۔ آج میرے مہمان ہیں۔ میں نے میر جعفر سے آپ کی ترقی کا ذکر کیا تھا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔

میر جعفر یہاں ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ وہ بردوان میں ہوں گے۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا۔ وہ ایک ضروری مشورے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان سے خوش نہیں۔ کہیے آپ مرشد آباد میں حضور نواب صاحب سے ملے تھے؟

نہیں! معظم علی نے جواب دیا۔ میں وہاں صرف میر مدن سے ملا تھا۔

اچھا یہ بتائیے آپ میر مدن سے میر جعفر کے متعلق کوئی بات کی تھی؟

نہیں ان کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی

عطاءاللہ خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔میر جعفر کا خیال ہے کہ دربار میں کہ بعض امراء ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں اور کئی مرتبہ انہوں نے مجھے بھی خبر ادار کیا ہے کہ مرشد آباد میں تمہارے خلاف بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں۔

میرا تو خیال ہے کہ حکومت مرہٹوں کی خلاف آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے۔تاہم اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔

مجھے آپ جیسے مخلص دوستوں کے نیک مشوروں کی ضرورت ہے کہیے!

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میر جعفر کے متعلق محتاط رہیں۔میر جعفر اگر کوئی غلطی کریں تو ان کا سب سے بڑا تحفظ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بنگال کے حکمران کے رشتہ دار ہیں۔

عطاءاللہ خاں نے کہا۔آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر میر جعفر کو پسند نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔

میں آپ کا شکرگذار ہوں۔لیکن آپ کے دل میں خیال کیسے پیدا ہوا کہ میر جعفر مجھے بہکا سکتا ہے؟

معظم علی نے پریشان ہوکر جواب دیا۔میں نے یہ نہیں کہا کہ میر جعفر آپ کو بہکا سکتا ہے۔میں نے صرف یہ کہا ہے کہ آپ محتاط رہیں۔

عطاءاللہ چند ثانیے غور سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔معظم علی! میں

تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔اگر مرشد آباد میں میرے دشمن میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں تو مجھے آگاہ کرنا تمہارا فرض ہے۔

مجھے آپ کے خلاف کسی سازش کا علم نہیں ہے۔اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر پریان ہوں گے تو میں آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔میر جعفر کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ بنگال میں ہر سازش سب سے پہلے ان کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔وہ چند جاہ پسندوں کو پہلے حکومت کی خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے علی وردی خاں کو باخبر کر دیتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کچل دی جاتی ہے۔چند مجرم اور انکے ساتھ چند بے گناہ مارے جاتے ہیں اور میر جعفر کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی انتہائی نا اہلی کے باوجود حکومت کے لیے ایک کار آمد آدمی ہیں۔میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا۔جب علی وردی خاں کو امراء کی آئے دن کی بغاوتیں اسی قدر بددل کر دیں گی کہ انہیں میر جعفر کے سوا اپنا کوئی خیر خواہ نظر نہ آئے گا اور یہ دن بنگال کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا۔

عطاءاللہ خاں نے کہا۔میں ایک سپاہی ہوں، مجھے اس سے کوی سروکار نہیں کہ میر جعفر کیا کرنا چاہتا ہے اور علی وردی خاں اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں

ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے عطاءاللہ خاں سے کہا۔میر جعفر تشریف لائے ہیں۔

معظم علی نے اٹھ کر کہا اب مجھے اجازت دیجئے۔

بہت اچھا۔عطاءاللہ خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

آپ میرے مکان پر جا کر آرام کریں۔

میر جعفر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد معظم علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔آپ کب آئے؟

میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔

تشریف رکھیئے !میر جعفر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

نہیں !مجھے اب اجازت دیجئے۔

عطاءاللہ خاں نے کہا۔میر صاحب یہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔انہیں آرام کی ضرورت ہے انشاءاللہ ہم شام کے وقت باتیں کریں گے۔

پھر وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔تم انہیں میرے مکان پر چھوڑ آؤ۔

معظم علی سپاہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔میر جعفر اور عطاءاللہ خاں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔بالآخر میر جعفر نے کہا۔ اس نوجوان کے متعلق آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔یہ میر مدن کا خاص آدمی ہے۔

عطاءاللہ خاں نے کہا۔میں اسے جانتا ہوں اور آپ نے کل جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔وہ کسی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔معظم علی کی باتوں سے میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ حکومت کے جاسوس ہمارے متعلق کافی چوکس ہیں۔معظم علی آپ کو میرا دشمن سمجھتا ہے اور اس نے مجھے آپ کے متعلق خبر دار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔

میر جعفر کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔آپ نے کہیں اسے اعتماد میں لینے کی کوشش تو نہیں کی؟

نہیں میر صاحب !میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے عزائم کے متعلق کس حد تک باخبر ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ مرشد آباد میں میرے متعلق کوئی خطرناک اطلاع پہنچی ۔تاہم یہ آپ کی بدقسمتی ہے کہ آپ کو ہر جگہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے ۔ہمیں اب تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے ۔فوج کے افسر میرے ساتھ ہیں ۔صوبیدار نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو وقت آنے پر اس کے گھر کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے ۔لیکن اس نوجوان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے ۔میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسے بروقت ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے ۔میرے نزدیک ہر آدمی کے ضمیر کی ایک قیمت ہے ۔لیکن معظم علی اس سے مستثنیٰ ہے،وہ پوری قوت کے ساتھ ہمارے مخالفت کرے گا اور سرحدی اضلاع کی چوکیوں کے کماندار کی حیثیت سے اس کی مخالفت ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کر دے گی ۔

میر جعفر نے کہا ۔لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سرح تک پہنچنے کا موقع دیا جائے ؟

نہیں ۔یہ ضروری نہیں ۔

میر جعفر نے کہا ۔لیکن موجودہ حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے خطرناک ہو گا ۔ہم اس پر ہاتھ ڈالے بغیر اسے سرحد تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں ۔میر حبیب کا ایلچی اگر واپس نہیں چلا گیا تو اسے یہ پیغام دے کر روانہ کر دیجئے ۔کہ معظم علی کل علی صبح یہاں سے روانہ ہو گا اور یہ وہی نوجواب ہے جس نے مرزا حسین بیگ کی حویلی کی حفاظت کی تھی ۔آپ اسے یہ بھی بتا دیں کہ وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہو گا ۔مرشد آباد سے صرف آٹھ سپاہی اس کے ہمراہ آئے ہیں اور یہی اس کے ساتھ یہاں سے جائیں گے ۔کٹک اور سرحدی علاقے کے درمیان کئی مقامات

ایسے ہیں۔جہاں میر حبیب کی آدمی اس کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہیں۔اگر یہ تجویز کامیاب ہوگئی تو ہمارے راستے سے ایک پتھر ہٹ جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔

میر جعفر نے کہا۔لیکن وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا؟

عطاء اللہ خان نے جواب دیا میں اُسے بتا چکا ہوں کہ اس کے حصے کی فوج بردوان اور میدن پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

میر جعفر نے کہا۔آپ میری توقع سے زیادہ دوراندیش ہیں۔

عطاء اللہ خاں نے مسکرا کر کہا۔میر صاحب! یہ سب آپ کی صحبت کا اثر ہے۔

اگلے روز صبح کی نماز کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہوکر قلعے سے باہر نکل رہے تھے کہ میر جعفر دروازے کے قریب ان کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

معظم علی ٹھہرو! اس نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

معظم علی نے گھوڑا روکا۔میر جعفر نے کہا۔ مجھے تمہاری فرض شناسی کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ تم فوج کو ساتھ لے کر جاتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر راستے ہیں تمہیں کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ آٹھ آدمی تمھاری حفاظت کیلئے کافی نہیں ہوں گے۔

معظم علی نے جواب دیا۔میرے حفاظت کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں ہے اور میں فوج کا انتظار میں یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

بہر حال تمہیں راستے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔گذشتہ چند دنوں میں مرہٹے یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر کئی بستیاں لوٹ چکے ہیں۔یہ کہہ کر میر جعفر،

معظم علی کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔معظم علی بنگال کی فوج کا بہترین سپاہی ہے اوراس کی جان بہت قیمتی ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کا خیال رکھو۔

معظم علی نے کہا۔آپ میری فکر نہ کریں

○

دن بھر سفر کرنے کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت ایک گاؤں کے زمیندار کے ہاں قیام کیا۔اگلے دن دوپہر کے وقت وہ ایک ندی کے قریب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لے رُکے ۔ندی کے دونوں کناروں پر گھنے درخت تھے ۔کچھ دیر سستانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہوگئے ۔نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ درختوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول رہے تھے کہ اچانک چاروں طرف درختوں کی آڑ سے قریباً پچاس مسلح مرہٹے نمودار ہوئے معظم علی کے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں پر سوار ہونے یا بندوقیں سنبھالنے کا موقع نہ تھا۔پچاس آدمی بندوقیں سیدھی کیے ان کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔

ایک آمدی نے آگے بڑھ کر کہا۔اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہتھیار پھینک دو ۔

معظم علی چند ثانیے تذبذب اور پریشان کی حالت میں کھڑا رہا۔بالآخر اس نے اپنی بندوق اور تلوار پھینک دی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی ۔

ایک ادھیڑ عمر آدمی جو اپنے لباس سے اس جتھے کا سردار معلوم ہوتا تھا۔آگے بڑھا اور اس نے معظم علی سے مخاطب ہوکر سوال کیا۔تم کہاں سے آئے ہو؟

معظم علی نے جواب میں کہا۔تمہیں ہم سے سوالات پوچھنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟

مرہٹہ سردار بولا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔

کہاں؟

مرہٹہ سردر نے جواب دیا۔ قیدیوں کو ایسے سوالات کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ میں تمہاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر کسی نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

مرہٹہ سردار کے اشارے سے چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر گھوڑوں اور اسلحہ پر قبضہ کرلیا اوران کی ہاتھ رسوں سے جکڑ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی اوراس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد انہیں سرحد کی پار ایک گاؤں کے قریب مرہٹہ فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ معظم علی اوراس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کی بندوقوں کے پہرے میں پڑاؤ عبور کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچے اور پھر ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک قلعہ نما حویلی کے اندر داخل ہوے۔ مرہٹہ فوج کے چند سپاہی انہیں دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔

معظم علی کو گرفتار کرنے والے دستے کے سردار نے ان کے افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ سپہ سالار کا حکم ہے کہ ان قیدیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ لیکن اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کسی توقف کے بغیر پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ سپہ سالار کچھ عرصہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ پھر اس نے معظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ بنگال کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں اور سپہ سالار کی ہدایت ہے کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوکر کہا انہیں لے جاؤ اور کوٹھریوں کے

اندر خاص خیال رکھا جائے۔

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ انہیں لے جاؤ اور کوٹھریوں کے اندر بند کر دو۔ فی الحال ایک کوٹھیر میں دو قیدی بند کیے جائیں۔

معظم علی نے آگے بڑھ کر افسر سے سوال کیا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم کس کی قید میں ہیں؟

اس نے بے رخی سے جواب دیا ایک قیدی کو ایسے سوالات پوچھنے کا حق نہیں۔

پھر وہ سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ انہیں اکبر خان کی ساتھ بڑی کوٹھری میں رکھو۔

پہریدار، قیدیوں کو حویلی کے ایک طرف لے گئے معظم علی کے ساتھ آٹھ ساتھیوں کو چار کوٹھریوں میں بند کر دیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے ایک کشادہ کوٹھری کا دروازہ کھولا اور معظم علی کو اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔

معظم علی کوٹھری کے اندر داخل ہوا اور پہریداروں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ درے کوٹھری کے درمیان بے حس حرکت کھڑا رہا۔ کواڑ کے دڑاڑ سے سہ پہر کے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھین۔ فرش پر کھجور کی چٹایاں بچھی ہوئی تھیں معظم علی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا معاً اسے کوٹھری کے ایک تاریک کونے میں ایک قیدی دکھائی دیا جو بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا۔ بھائی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے کچھ عرصہ لے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔

قیدی جلدی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور معظم علی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا

میرا نام اکبر خاں ہے مجھے مرہٹوں کی قید میں قریباً تین مہینے گزر چکے ہیں۔ پہلے مجھے اس حویلی کی اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی بیس دن ہوئے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی جب سے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔

معظم علی حیرانی کے عالم میں قیدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ چودہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ و سپید چہرے کے تیکھے نقوش میں غایت درجے کی جاذبیت تھی۔

تمہیں کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟ معظم علی نے سوال کیا۔

میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کمسن لڑکے نے قدرے برہم ہو کر جواب دیا۔

معظم علی نے کہا تمہاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟

لڑکے نے اس سوال کا جواب مختصراً اپنی سرگزشت شروع کر دی۔

مریا گاؤں روہیلکھنڈ میں ہے۔ عظیم خاں میرے ابا جان تھے اور وہ اپنے علاقے کے سردار تھے۔ انہیں گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ وہ راجپوتانہ سے گھوڑے خرید کر کبھی لکھنوء اور کبھی حیدر آباد میں فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا بڑا بھائی عام طور پر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس سال میں نے ضد کی اور وہ اس کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ساتھ چالیس مسلح نوکر تھے اور ہم راجپوتانہ سے ڈیڑھ سو گھوڑے خرید کر لکھنوء کی طرف آ رہے تھے۔ راستے میں اودھ کی سرحد سے تھوڑی دور مرہٹوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ابا جان اور ان کے ساتھ پندرہ اور آدمی لڑائی میں شہید ہو گئے۔ سات آدمی مرہٹوں نے گرفتار کر لیے اور باقی

بھاگ گئے۔مرہٹوں کے سردار نے باقی آدمیوں کی تلاشی لے کر چھوڑ دیا۔لیکن مجھے اپنے پاس رکھا اور چند دن بعد میر حبیب کے پاس بھیج دیا۔میر حبیب نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔وہ کبھی کبھی چند دن کے لیے یہاں آتے ہیں اور ہمیشہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے۔تمہیں میرے سپاہیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی۔اگر میں کسی کی شکایت کرتا ہوں تو اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔لیکن جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھر پہنچا دیا جائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ جب میں روہیلکھنڈ پر حملہ کروں گا۔تو تمھیں ساتھ لے جاؤ گا۔تمھارے باپ نے اپنے گھر میں بیشمار دولت جمع کر رکھی ہے اور جب تم مجھے اپنے گھر کا خزانہ تلاش کرنے میں مدد دو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے گھر میں کوئی خزانہ نہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر تمہیں خزانے کا علم نہیں تو ہم تمھارے بھائی سے پوچھ لیں گے۔میر حبیب کو یہ یقین تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔اس لیے مجھے اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ایک شام میں یہاں سے بھاگ گیا اور ساری رات جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھومتا رہا۔لیکن صبح کے وقت چند سوار مجھے دوبارہ گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔خوش قسمتی سے میر حبیب یہاں نہیں تھا۔اور اس کے سپاہیوں نے مجھے اس کوٹھری میں بند کرنے کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی۔جب میر حبیب آیا تو اس نے مجھے دو دن بھوکا رکھنے کی سزا دی۔اب پہریدار مجھے صبح شام تھوڑی دیر کے لیے اس کوٹھری سے باہر نکالتے ہیں لیکن ان کا پہرہ اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اب میرے لیے دوبارہ بھاگ نکلنا ممکن نہیں ہے۔مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی ان کی قید میں ہیں۔بتائیے آپ یہاں کیسے پہنچے؟

معظم علی نے جواب دیا۔میں کٹک سے اڑیسہ کے ایک سرحدی قلعے کی طرف

آرہا تھا۔راستے میں مرہٹوں نے اچانک حملہ کیا اور مجھے گرفتار کرلیا۔تم سے باتیں کرنے سے پہلے مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں میر حبیب کی قید میں ہوں۔

O

چھ ماہ بعد ایک صبح چار مسلح سپاہیوں نے معظم علی کوٹھری سے نکالا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔معظم علی کوئی سوال کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔سپاہی ایک کمرے کے دروازے پر رُکے اور معظم علی انکے اشارے پر کمرے کے اندر داخل ہوا۔

یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت سازوسامان سے آراستہ تھا۔اور دو آدمی قالین پر بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔یہ دونوں اپنے لباس مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور دوسرا جس کی عمر چالیس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی دوہرے جسم کا ایک بارعب آدمی تھا۔

تمھارا نام معظم علی ہے؟قوی ہیکل آدمی نے سوال کیا۔

ہاں۔معظم علی نے جواب دیا

میں نے اپنے سپاہیں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی قیدی کو بلاوجہ تکلیف نہ دی جائے تمھیں میرے آدمیوں سے کوئی شکایت تو نہیں؟

معظم علی نے جواب دیا۔ایک قیدی کو کیا شکایت ہوسکتی ہے۔

ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو بہت زیادہ محسوس نہ کرو۔میں بہادروں کی عزت کرتا ہوں اور تم مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت میں اپنی جرأت وہمت کا ثبوت دے چکے ہو۔

معظم علی نے کہا۔آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں

تمھارے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے مجھے کسی کے پاس جانے کی

ضرورت نہ تھی ۔اب یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ سرحد کا نائب فوجدار اور اس کی آٹھ ساتھی کہیں روپوش ہو گئے ہیں اور میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا، کہ یہ نائب فوجدار کون ہے۔

میں اپنی ذات کے لیے آپ سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔لیکن اگر آپ میر حبیب ہیں تو میں بنگال سے آپ کی دشمنی کی وجوہات پوچھنا چاہتا ہوں ۔

میر حبیب نے جواب دیا ۔میں کسی کا دوست ہوں نہ دشمن ۔میری دلچسپی صرف بنگال کے حکمران اور امرا کی دولت سے ہے۔

لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں ۔

مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں ۔مجھے افسوس ہے کہ تم کسی دولتمند آدمی کے بیٹے نہیں ہو۔لیکن اگر تم مجھے کسی دولت مند آدمی کا گھر کا پتہ بتا سکو تو مجھے تمھارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

معظم علی نے غصے میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔میں تمہیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہوں اور وہ مرشد آباد کا قید خانہ ہے۔

میر حبیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔قید خانے میں وہ جاتے ہیں جن کی کسی کو بھی ضرورت نہ ہو اور میں بدترین حالات میں بھی بنگال کے حکمران کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اسے میری ضرورت ہے۔تم ایک ذہین آدمی ہو لیکن میں حیران ہوں کہ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ بڑے بڑے امراء کی تجوریوں پر پہرہ دے کر بنگال کی کوئی خدمت کر رہے ہو؟

اگر تمہیں اس بات کا افسوس ہے کہ تمھارے سپاہی حسین بیگ کے گھر سے نامراد واپس آئے تھے تو میں تمھاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں ۔مرزا حسین بیگ

کے گھر میں روپیہ نہیں بلکہ عزت تھی۔ جس کی حفاظت ہر شریف آدمی کا فرض تھا۔

میر حبیب نے جواب دیا۔ میں نے اونچے طبقے میں کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو عزت کے معنی سمجھتا ہو۔ وہ صرف دولت اور حکومت کے معنی سمجھتے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔ میں جس بنگال کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں وہ صرف امیروں اور حکمرانوں کا بنگال نہیں ہے میرا وہ بنگال ہے جسے لاکھوں مسلمان اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور میں اسے چوروں، راہزنوں اور انسانیت کے دشمنوں سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔

نوجوان! میں تمھارے خیالات کی داد دیتا ہوں لیکن جس بنگال کو میں جانتا ہوں اس کے محافظ میرے نزدیک باہر کے رہزنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دن بہت جلد آرہا ہے جب تم بنگال کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے متعلق سوچنا زیادہ بہتر سمجھوگے۔ صرف علی وردی خاں کے آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم بنگال کے متعلق سوچنا بھی حماقت سمجھوگے۔ اتنی دیر میں شاید تم میری قید میں رہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے ہی تمھارے خیالات میں کوئی تبدیلی آجائے تو میں بڑی خوشی کیساتھ تمھارا تعاون قبول کروں گا۔ پھر ہم بنگال کے متعلق نہیں بلکہ اپنے متعلق سوچیں گے۔ بالکل مرشد آباد کے امراء کی طرح جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو علی وردی خاں کا واحد جانشین سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کے نعروں کے جواب میں ہمیں بھی یہ نعرہ لگانے کا حق ہے کہ بنگال ہمارا ہے۔

معظم علی نے کہا۔ اگر آپ کی رفاقت سے مجھے دلی کا تخت ملنے کی امید ہو تو بھی میں ایک قیدی کی حیثیت میں گمنامی کی موت کو ترجیح دوں گا۔

میر حبیب نے کہا۔ انسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں چند ماہ یا چند

برس انتظار کرسکتا ہوں ۔اس دوران میں میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہ ہو تمہیں حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی پوری آزادی ہوگی لیکن اگر تم بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو!

معظم علی کمرے سے باہر نکلا اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ جو دروازے کے باہر کھڑے تھے چل دیا۔

O

علی وردی خاں کی افواج ،میدنا پور کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں ۔میر جعفر علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا۔اور تین دفعہ فرشی سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا ۔علی وردی خاں کی مسند کے پیچھے دو محافظ ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے ۔میر جعفر چند ثانیے خوف و اضطراب کی حالت میں کھڑا رہا۔بالآخر علی وردی خاں نے کہا ۔ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عطاء اللہ خاں یہاں حاضر ہونے سے کیوں پس و پیش کر رہا ہے۔

عالیجاہ! مجھے معلوم نہیں ۔

علی وردی خاں نے کہا ۔ہمارے خلاف کوئی سازش تمھارے علم کے بغیر نہیں ہوتی ۔

عالیجاہ! اگر مجھے اس کی سازش کا علم ہوتا تو میں اس کا سر لے کر حضور کی خدمت میں پیش ہوتا۔

اس کے سر کے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے ۔فی الحال ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے عزائم کیا ہیں اور اسے ہماری حکم عدولی کی جرات کیسے ہوئی اور معظم علی کا

آج تک کیوں پتہ نہیں چلا؟

عالیجاہ! کٹک کا صوبیدار آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسر عطاءاللہ خاں کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس کی نیت بری ہو تو بھی وہ موجودہ حالات میں حضور کے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی جان کے خوف سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے پس وپیش کرتا ہے۔ میں نے حضور کا حکم ملتے ہی معظم علی کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ بدقسمتی کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے فوج کا انتظار کر لو اور میرے اس مشورے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے سرحد کے آس پاس مرہٹوں کی سرگرمیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن معظم علی ایسے مشورے سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مارا گیا ہے یا قید ہو گیا ہے۔ بہر حال وہ کٹک سے میرے سامنے روانہ ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عطاءاللہ خاں نے اس کے خلاف کوئی سازش کی وہ لیکن یہ ثابت کرنا آسان نہیں۔

علی وردی خاں نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا۔ عطاءاللہ خاں کے متعلق تمھارا کیا مشورہ ہے؟

عالیجاہ! میرا خیال ہے وہ ڈر کے مارے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ میرے یہ درخواست ہے کہ حضور کوئی اقدام اٹھانے سے پہلے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دیں اگر اس کی نیت خراب ہے تو ممکن ہے میں اسے یہ سمجھا سکوں کہ تمھاری سازش طشت ازبام ہو چکی ہے اور تمھارے بچاؤ کی اب یہی ایک صورت ہے کہ تم کسی توقف کے بغیر حضور کی قدبوسی کیلئے حاضر ہو جاؤ۔

علی وردی خاں نے کہا اسے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم اسے

براہِ راست پر لا سکتے ہو تو اسے کہوں کہ وہ استعفادے کر سید حامر شدآباد چلا جائے۔

عالیجاہ! اگر میں اسے یقین دلا سکوں کہ آپ نے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مرشد آباد جانا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔

تمہیں غداروں کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔بہر حال اگر ہو راست پر آ جئے تو ہم اس کے لے معمولی سزا کافی سمجھیں گے۔

○

رات کے وقت عطاءاللہ خاں اپنی قیام گاہ میں گہری نیند سو رہا تھا۔اس کے نوکر نے اسے جگایا اور کہا میر جعفر نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کے ااور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

تم جا کر سپاہیوں کے آرام کا بندوبس کرو، میں ابھی آتا ہوں۔

فوجی افسر اٹھ کر باہر نکل گئے اور میر جعفر نے عطاءاللہ خان سے کہا مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو بروقت خبردار کیا جائے۔

وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔عطاءاللہ خاں کچھ دیر انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہیں۔مجھے میدنا پور میں علی وردی خاں کی آمد کی اطلاع ملتے ہی یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی ساتھی نے انہیں ہمارے ارادوں سے خبردار کر دیا ہے۔

میر جعفر نے کہا۔مجھے اس بات کا یقین نہیں۔لیکن آپ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آپ علی وردی خاں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔میں آپ

کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میدنا پور میں علی وردی خاں کی غیر متوقع آمد کے بعد ہماری سازش کی کامیابی کے امکانات بہت محدود ہو چکے ہیں۔اس کے لشکر کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔اگر ہو کٹک پہنچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی فوج کے بیشتر سپاہی اپنی شکست کو یقینی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔آپ کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی اور وہ یہ کہ استعفا دے کر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔میں نے علی وردی خاں کو آپ کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ مستعفی ہو کر مرشد آباد چلے جائیں تو آپ پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔

عطاء اللہ خاں کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے میر جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے کہا۔

علی وردی خاں نے آپ سے بھی استعفے کا مطالبہ کیا ہے؟

نہیں اور اگر آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی عطاء اللہ خان نے جواب دیا۔میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے مرہٹوں کی پناہ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔میر صاحب آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں اس وقت فوج کو کوچ کا حکم دیتا ہوں۔میر حبیب سرحد سے زیادہ دور نہیں۔ہمیں اس کی پناہ لے کر علی وردی خاں کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کا وقت مل جائے گا۔

میر جعفر نے جواب دیا۔میں یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔میرے حبیب ایک ڈاکو ہے۔اور اس کی دوستی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔وہ بنگال کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کی امید پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اسے آپ کی کامیابی کا یقین ہو۔لیکن جب آپ

ایک شکست خوردہ آدمی کی حیثیت میں اس کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو چند ٹکوں کے عوض میں علی وردی خاں کے ہاتھ فروخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر مستعفی نہ ہوئے تو بھی علی وردی خاں آپ کو سبکدوش کردے گا۔اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ابھی انہیں یہ لکھیں کہ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کا اعتماد کھو چکا ہوں اور میرے مخالفین آپ کو بدظن کرنے کے لیے میرے متعلق اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ میں آپ کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستعفی ہو جاؤں اور آپ سے یہ درخواست کروں کہ مجھے مرشد آباد میں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنے کی اجازت دی جائے لیکن اگر آپ کو کسی وقت میری نیک نیتی کا یقین آجائے تو مجھے ہر وقت اپنی خدمت کے لیے تیار پائیں گے۔

عطاءاللہ خاں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔میر صاحب آپ کو یقین ہے کہ استعفاد ینے کے بعد مرشد آباد جانا میرے لیے خودکشی کے مترادف نہیں ہوگا؟

نہیں! بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کو مرشد آباد پہنچتے ہی علی وردی خاں کا یہ پیغام ملے گا کہ ہمارے تمام شکوک دور ہو چکے ہیں اور تمھیں فلاں عہدہ پر مامور کیا جاتا ہے۔

عطاءاللہ خان نے کہا مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی جلدی بازی ہار چکا ہوں۔

میر جعفر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔میرے دوست آپ نے بازی نہیں ہاری۔ علی وردی خاں اپنی عمر کے آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہے۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم چند مہینے یا چند برس اور انتظار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی شکست کا

اعتراف کرنے یا ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دینے نہیں آیا بلکہ یہ مشورہ دینے کے لے آیا ہوں کہ آپ ہتھیار اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں۔

عطاءاللہ خاں نے کہا میر صاحب! جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے تو آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے ایسی صورت حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اب اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو میں استعفا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن استعفے کا جواب آنے تک میرا یہاں رہنا ضروری ہوگا۔ پھر اگر علی وردی خاں نے مجھے مرشد آباد جانے سے منع کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آپ کو جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ استعفا میرے حوالے کریں اور کسی تاخیر کے بغیر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ علی وردی خاں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا۔

عطاءاللہ خاں نے اٹھ کر دروازے کے قریب جا کر نوکر کو آواز دی اور کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ اور پھر میر جعفر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ میر صاحب! استعفے کا مضمون لکھنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔

بہت اچھا! میں بولتا جاؤں گا اور آپ لکھتے جائیں۔

دوسرے روز علی الصباح عطاءاللہ خاں مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا اور اس کی روانگی کے چند دن بعد میر جعفر میدنا پور پہنچ کر علی وردی خاں سے یہ کہہ رہا تھا۔ عالیجاہ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری باتوں میں آ کر استعفا دیا، ورنہ اس کے عزائم بہت خطرناک تھے۔ مرشد آباد میں وہ حضور کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے جاسوس ہر وقت اس کی نگرانی کے لیے موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی نادان دوست نے بہکایا تھا۔ اب اگر حضور کی اجازت ہو تو میں اسے یہ لکھنا

چاہتا ہوں کہ حضور والا شان نے تمھارا استعفا منظور کر لیا ہے۔ سابقہ غلطیوں کے بارے میں تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ لیکن آئندہ کیلئے تمہیں بے حد محتاط رہنا چاہیے۔

اور علی وردی خاں اس کا جواب میں کہہ رہا تھا۔ ہاں اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ اس کی سابقہ فوجی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے گزارے کیلئے ایک معقول وظیفہ دیا جائے۔

ساتواں باب

میر حبیب کی قید میں معظم علی کے لیے زندگی صبح و شام کے ایک بے کیف تسلسل کا نام تھی۔ اسے بنگال کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ قید کی تنہائی میں اکبر خاں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ذہنی کرب کے باعث معظم علی کئی کئی گھنٹے خاموش رہتا اور اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ بھائی جان! آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خدا ہماری مدد کرے گا اور ہم بہت جلد ان ظالموں کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کہتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ میں ہر وقت آپ کی رہائی کے لیے دعا مانگا کرتا ہوں۔ آپ کہتے تھے خدا اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔ لیکن آج آپ مغموم ہیں۔

جب مسکرانے کی کوشش کے باوجود اکبر خاں کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں تو معظم علی خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر اسے تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ اکبر میں اپنے متعلق نہیں، بلکہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟

پھر وہ آپس میں بار بار کہ ہوئی باتیں اور حال کی مایوسیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش کرتے۔ اکبر خان اپنے وطن کے حسین اور دلکش مناظر بیان کرتا اور معظن علی اسے مرشد آباد کی ان گلیوں اور مکانوں کے متعلق بتاتا جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک دوسرے کا وطن دیکھنے کا وعدہ کرتے۔

اکبر خاں اپنی عمر کے عام بچوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ اور ذہین تھا۔ وہ معظم

علی کو اس حویلی کے اندر اور باہر مرہٹوں کے کیمپ کے تمام حالات بتا چکا تھا۔ فرار کی کوشش سے پہلے جب اسے ادھر اُدھر گھومنے کی آزادی تھی وہ پڑاؤ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ معظم کو بتا چکا تھا کہ مرہٹے گاؤں کے اصل باشندوں کو نکالنے کے بعد ان کے مکانات پر قبضہ کر چکے ہیں بیشتر مکانات ان کے گھوڑوں کے لیے اصطبلوں کا کام دیتے ہیں اور بعض مکانات میں انہوں نے گولہ بارود اور رسد کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں۔ پہریداروں کی ٹولیاں دن رات گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتی ہیں۔ گاؤں کے باہر چاروں طرف مرہٹہ سپاہیوں کے خیمے ہیں۔ اس حویلی کی چاردیواری کے اندر بھی بعض کوٹھڑیوں کے تہہ خانوں میں رسد اور بارود کے ذخیرے جمع ہیں۔

اکبر خاں سے متعدد سوالات پوچھنے کے بعد معظم علی کو اپنی کوٹھڑی سے باہر ہر دیوار، ہر گلی اور ہر مکان کا نقشہ حفظ ہو چکا تھا۔ صبح شام انہیں تھوڑی دیر ہوا خوری کے لیے قید خانے سے باہر نکالا جاتا۔ معظم علی حویلی کے اندر دوسرے قیدیوں کے علاوہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے ملتا لیکن مسلح پہریدار ہر وقت اس کے سر پر موجود ہوتے اور اسے کسی سے بات کرنے کا موقع نہ دیتے۔

ایک دن اکبر خان فرار ہونے کے متعلق اسے اپنی نئی تجویز بتا رہا تھا۔ معظم علی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ اکبر خاں تمہیں معلوم ہے کہ بھاگنے کی ناکام کوشش ہمارے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔ پھر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر تم اس کوٹھڑی سے باہر رہ کر گردوپیش کے حالات معلوم کر سکو تو شاید ہم بھاگنے کے متعلق کوئی بہتر تجویز سوچ سکیں میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ اگر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تو ممکن

ہے ہم بہت جلد رہا ہو جائیں۔

اگلے دن پہریدار کھانا لے کر آتا تو معظم علی نے اس سے کہا۔ میں میر حبیب سے ملنا چاہتا ہوں۔

پہریدار نے جواب دیا وہ یہاں نہیں ہیں جب وہ آئیں گے تو آپ کی درخواست پہنچا دی جائے گی۔

معظم علی انتہائی بے چینی سے میر حبیب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ روزانہ صبح اٹھتا اور پہریداروں سے پوچھتا مگر اسے نفی میں جواب ملتا۔

کوئی دس ماہ انتظار کے بعد پہرے داروں کے ایک افسر نے اس کے پاس آکر اطلاع دی کہ میر حبیب تشریف لائے ہیں ار آپ کی درخواست ان تک پہنچا دی گئی ہے لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

معظم علی نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں چند دن اور گذارے۔ ایک دن اچانک اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور میر حبیب فوج کے دو افسروں اور چار مسلح سپاہیوں کے ہمراہ کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی اور اکبر خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میر حبیب نے سوال کیا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

معظم علی نے جواب دیا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آپ ایک بہادر آدمی ہیں۔ لیکن بہادری اور بے رحمی میں بہت فرق ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم بچے نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور آپ اسے کب تک قید میں رکھنا چاہتے ہیں؟

میر حبیب نے جواب دیا۔ ایک قیدی کو دوسرے قیدی کی سفارش کا حق نہیں۔

تاہم ذاتی طور پر میرے یہ خواہش نہ تھی کہ اکبر کو کوٹھڑی میں بند کیا جائے۔لیکن اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی شکل دیکھ کر رحم آ گیا تھا۔

معظم علی نے اکبر خان کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر میر حبیب کا دامن پکڑتے ہوئے کہا۔خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجئے۔اب اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو مجھے گولی مار دیجئے۔

میر حبیب نے کہا۔میرا خیال تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔

نہیں!نہیں!اکبر خان نے جواب دیا۔میں کھلی ہوا میں رہنا چاہتا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وطن کس سمت ہے لیکن اگر یہ بھاگ بھی جائے تو آپ کے لیے کون سے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے؟

میر حبیب نے کہا۔دیکھو اکبر!میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمہیں باقی تمام عمر اس تہہ خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں دوپہر کے وقت بھی روشنی نہیں پہنچتی۔

پھر وہ پہریداروں کی طرف متوجہ ہوا۔اسے لے جاؤ۔لیکن اس کی اچھی طرح خیال رکھو۔

اکبر خاں ایک پہریدار کے ساتھ باہر نکل گیا۔میر حبیب دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک مڑا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔میرا خیال تھا کہ تم اپنے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہو؟

اپنے متعلق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کی قید میں ہوں۔جس سے رحم یا انصاف کی درخواست کرنا بے سود ہے اور اس وقت کا

انتظار کر رہا ہوں جب انصاف کی تلوار میرے ہاتھ میں ہوگی۔

میر حبیب غصے میں آنے کی بجائے مسکرایا اور اس نے سوال کیا۔ جب انصاف کی تلوار تمہارے ہاتھ میں ہوگی تو تم کیا کرو گے؟

میں آپ کو اس سے بہتر کوٹھڑی دوں گا اور آپ کے ساتھ کوئی ایسا قیدی نہیں رکھوں گا۔جس کی مظلومیت اور بے کسی کے احساس سے آپ اپنی تکالیف بھول جائیں۔

تم بیوقوف ہو۔ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔میر حبیب یہ کہہ کر نکل گیا۔

O

قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے حویلی کے صحن میں تین چھولداریاں نصب تھیں ۔درمیانی چھولداری ذرا بڑی تھی جس میں قیدیوں کے محافظوں کا جمعدار رہتا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو چھولداریوں میں آٹھ سپاہی رہتے تھے۔گرمی کے موسم میں قیدیوں کے محافظ دن کے وقت ان چھولداریوں میں پناہ لیتے تھے۔لیکن رات کے وقت وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے سامنے کھلی فضا میں آرام کرتے تھے۔دو دو پہریداروں کی چار ٹولیاں رات کے وقت باری باری قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے گشت کرتیں اور شام سے صبح تک ہر تین گھنٹے کے بعد پہرہ بدلتا تھا۔اس چوکی کے دوسرے محافظ جن کی تعداد عام طور پر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی بڑے دروازے کی طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں اور بانس کے چھپروں میں رہتے تھے۔

میر حبیب نے اکبر خاں کو معظم علی کی کوٹھڑی سے نکال کر قیدیوں کے محافظ سپاہیوں کے جمعدار کے سپرد کر دیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ اکبر خان کو کوئی تکلیف

نہ ہو۔یہ جمعدار ایک مرہٹہ تھا اور اس کا نام مرلی دت تھا۔مرلی دت بے حد موٹا تھا۔ وہ سر سے گنجا تھا اور اس کے سیاہ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔دو سال قبل وہ میر حبیب کی فوج کے اچھے سپاہیوں میں شمار ہوتا تھا۔لیکن ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے باعث اس کی بائیں ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔اپنے ماتحت سپاہیوں کی ساتھ وہ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن اکبر خان کے ساتھ اس کا برتاؤ نسبتاً بہتر تھا۔اس نے اکبر خان کو قید خانے کی کوٹھری سے نکالنے کے بعد، اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا ۔میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی لیکن تم نے بھاگنے کی کوشش کی۔میر صاحب نے تمہیں ایک موقع اور دیا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اب بھی میں تمھیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمھارا انجام بہت بُرا ہو گا۔

اکبر خان نے انتہائی معصومیت کے انداز میں جواب دیا۔جی میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔

تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی شرات نہ کرو!

چند دنوں کے اندر اکبر خان، مرلی دت کے لیے ایک کارآمد نوکر بن چکا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر چھولداری میں جھاڑو دیتا۔اس کا بستر درست کرتا اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھوتا۔سپاہی اس پر اس لیے خوش تھے کہ پہلے اس قسم کے تمام کام انہیں کرنے پڑتے تھے۔

مُرلی دت کو بانسری بجانے اور اس سے زیادہ سننے والوں سے داد حاصل کرنے کا شوق تھا۔لیکن اس کے چند سپاہیوں کے علاوہ جو اسے ایک مجبوری سمجھ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے، قلعے میں کسی اور کو اس کے اس فن سے دلچسپی نہ تھی بلکہ

دوسرے سپاہی اور افسر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔بانسری بجانے کے علاوہ اسے گانے کا بھی شوق تھا۔لیکن بدقسمتی سے اس کی آواز اس کی صورت سے بھی زیادہ کریہہ تھی۔

اکبر خاں کو اس کی کمزوری کا علم تھا۔اور وہ جی کھول کر اسے داد دیا کرتا تھا۔وہ کہتا چچا مرلی دت! آپ! آپ تو کمال کرتے ہیں۔میں نے کسی اور کو اتنی اچھی بانسری بجاتے نہیں دیکھا۔

اور وہ جواب دیتا۔اسے سمجھنے کیلئے عقل کی ضرورت ہے اور تم ان سب سے زیادہ سمجھدار ہو۔

چچا مرلی دت! آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔کاش میں بھی اس طرح گا سکتا۔اور مرلی دت خوش ہو کر کہتا۔گانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے بیٹا! آہستہ آہستہ اکبر خان پر مرلی دت کا اعتماد بڑھتا گیا۔اسے حویلی کے اندر گھومنے کی آزادی تھی جب قیدیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ان کے پاس چلا جاتا۔پہریداروں کی موجودگی میں اسے عام طور پر معظم علی سے باتیں کرنے کا موقع نہ ملتا۔لیکن کب کبھی سپاہیوں کی توجہ دوسری طرف ہوتی تو وہ آہستہ سے کوئی بات کہہ کر نکل جاتا۔

جب سپاہی قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کبھی روٹیوں کی ٹوکری اور کبھی پانی کا مٹکا پکڑ لیتا۔آہستہ آہستہ پہریدار اس سے اس قسم کا کام لینے کے عادہ ہوتے گئے۔پانچ ہفتوں کے بعد یہ حالت تھی کہ جب قیدیوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آتا تو سپاہی اسے کبھی کنویں سے پانی اور کبھی لنگر خانے سے کھانا لانے کے لیے کہتے۔

کوٹھڑیوں کے تالوں کی چابیاں مرلی دت ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔رات کے وقت قیدیوں کو کھانا دینے کے بعد وہ چابیوں کا گچھا چھولداری کے اندر ایک لکڑی کے صندوق میں بندوق میں بند کر دیتا تھا۔اور صندوق کے تالے کی چابی جو ایک دھاگے میں بندھی ہوئی تھی ۔اپنے گلے میں ڈال لیتا تھا ۔پہریدار ہر صبح قیدیوں کو باہر نکالنے کے لیے مرلی دت سے چابیاں لینے آتے تھے ۔ایک دن اس کی طبعیت ذرا خراب تھی اس نے لیٹے لیٹے اکبر خان کو صندوق کی چابی دیتے ہوئے کہا۔جاؤ تم نکال دو!

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد اکبر خاں مستقبل طور پر یہ کام اپنے ذمے لے چکا تھا ۔

O

ایک رات ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ۔مرلی دت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بانسری بجاتا رہا اراس کے بعد اپنی موٹی اور بھدی آواز میں اکبر خاں کو چند گیت سنانے کے بعد لیٹ گیا۔تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں اس کے خراٹے جو حویلی کے تقریباً ہر سپاہی اور افسر کے لیے موضوع بحث بن چکے تھے ۔اکبر خاں کو پریشان کر رہے تھے ۔پچھلے پہر جب بارش تھم گئی تو اکبر خاں نے اپنی کھاٹ چھولداری سے باہر نکال لی ۔

دو پہریدار گشت کر رہے تھے ۔ان میں سے ایک نے پوچھا۔کیوں اکبر خان کیا بات ہے؟

کچھ نہیں!چچا مرلی دت بین بجا رہا اور مجھے نیند نہیں آتی ۔

پہریدار نے اس کے قریب آ کر کہا۔میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ توپ کی آواز بھی

اس سے زیادہ تکلف دہ نہیں ہوتی۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو مرلی دت کے ساتھ چھولداری میں رہنے کی بجائے تہ خانے میں رہنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن دیکھو یہ بات کہیں اس سے نہ کہہ دینا۔

دوسرے سپاہی نے کہا۔ بھئی اکبر خاں! سچ بتاؤ تمھیں واقعی ان کا گانا پسند ہے؟

آدھی رات تک وہ بانسری بجاتے رہے اور پھر جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر سونے کے لیے وقت مل جائے گا تو تم گانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔

ان کا گانا مجھے بہت پسند ہے۔ اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔

صبح کے وقت پہریدار نے اکبر خاں کو جگایا اور کہا۔ جاؤ چابیاں لے آؤ۔

اکبر خاں آنکھیں ملتا ہوا چھولداری میں داخل ہوا تو مرلی دت بدستور خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے مرلی دت کو جگانے کی بجائے آگے بڑھ کر اطمینان سے دھاگے کی گرہ کھولی اور اس کے گلے میں چابی اتار لی۔ پھر اس نے صندوق کا تالا کھولا اور قید خانے کی چابیوں کا گھچا لے کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کھاٹ چھولداری کے اندر لے آتا۔ اور اس پر لیٹے ہی گہری نیند سو گیا۔

اچانک اسے مرلی دت کی آواز سنائی دی۔ اکبر خاں! اکبر خاں!! بہت دیر ہو ئی جاؤ پہریداروں کو چابیاں دے آؤ۔ مجھے نیند آئی ہے۔

اکبر خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مرلی دت نے اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بدحواس ہو کر کاہ۔

ارے میری چابی کہاں گئی؟

اکبر خاں نے اپنے گلے سے چابی اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ لیجئے ۔میں نے پہریداروں کو چابیاں نکال دی ہیں ۔آپ گہری نیند سو رہے تھے۔اس لیے میں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

تم بہت شریر ہو۔مرلی دت نے چابی کا دھاگا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا ۔لیکن مجھے بہت دیر سے نیند آتی تھی ۔تم نے اچھا کیا کہ مجھے جگایا نہیں۔

اب مجھے نیند آرہی ہے۔اکبر خان نے کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔اس واقعہ سے چند ہفتے بعد صبح کے وقت قیدیوں کو کوٹھڑیوں سے باہر نکالا گیا تو اکبر خاں نے موقع پا کر معظم علی سے کہا۔میر حبیب کل کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں پہرہ سخت نہیں ہوتا۔بادل آرہے ہیں اگر آج رات بارش شروع ہوگئی تو آپ تیار رہیں۔

شام کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے،مرلی دت چھولداری کے باہر کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے بانسری بجارہا تھا۔اکبر خان پہریداروں کے ساتھ قیدیوں کو کھانا تقسیم کرنے کے بعد اس کے پاس آیا اور اس نے چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔چچا مرلی دت آج بہت گرمی ہے۔میں نے سنا ہے کہ بعض راگنیاں بارش لے آتی ہیں۔آپ کو کوئی ایسا راگ آتا ہے؟

مرلی دت نے بے پروائی سے جواب دیا۔راگ آدمی کے لیے ہوتے ہیں، بادلوں کے لئے نہیں۔اور پھر بانسری بجانے میں مصروف ہوگیا۔

اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔چچا مرلی دت چابیاں اندر رکھ آؤں

۔

مرلی دت نے جواب دینے کی بجائے اپنے گلے سے صندوق کی کنجی نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اکبر خاں چابیوں کا گچھا لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا چند ثانیے توقف کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا صندوق کے پیچھے رکھ دیا۔ پھر اس نے صندوق کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا کھولا اور اس کا ڈھکنا روز سے بند کرنے کے بعد تالا لگا کر باہر نکل آیا۔

کیسے بیوقوف ہو۔ مرلی دت نے جھنجھلا کر کہا۔ تم میرا صندوق توڑ ڈالو گے۔

اکبر خاں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ چچا! اندر بہت گرمی ہے۔ دیکھو مجھے پسینہ آرہا ہے۔

آج بارش ضرور آئے گی۔ اس نے اکبر خان کے ہاتھ سے چابی لے کر گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اکبر خان مرلی دت کے سامنے دوسری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آس پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا۔

بھئی یہاں آؤ۔ آج چچا مرلی دت کمال کر رہے ہیں۔ اور سپاہی مرلی دت کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اس کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ کر اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

مُرلی دت نے کہا۔ راگ سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اب ذرا غور سے سنو۔ اور وہ کوئی ایک گھنٹہ انتہائی بیچارگی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ اچانک بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بادل گرجا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

اکبر خاں نے کہا۔ چچا مرلی دت بارش آ گئی اُٹھیے آپ کی کھاٹ اندر کر دوں۔

اور وہ بدستور بانسری بجاتا ہوا چھولداری کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر اکبر خان اور مرلی دت چھولداری کے اندر اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے رہے مرلی دت بانسیر بجانے کی بجائے ایک انتہائی نا قابل برداشت لے میں گا رہا تھا۔وہ گاتے گاتے سو گیا اور پھر اس کے خراٹے تاریک رات کی ہولناکی میں اضافہ کرنے لگے۔

اکبر خاں کے دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہونے لگیں۔وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔بالآخر اٹھا اور کھاٹ سے اتر کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل فرش پر چلتا ہوا صندوق کے پاس پہنچا۔

صندوقت کے پیچھے چابیوں کے گچھے کو ہاتھ لگنے سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔لیکن مرلی دت کے خراٹوں کے تسلسل نے اس کے توہمات دور کر دیئے۔وہ مڑا اور اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چھولداری کے دروازے پر کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی اور کیچڑ میں دو پہریداروں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔اکبر خاں دبے پاؤں معظم علی کو کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔وہ کوٹھڑی کے تالے میں یکے بعد دیگرے مختلف چابیاں لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔وہ دروازے کے ساتھ چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔خوف و ہراس کے باعث اس کی یہ حالت تھی کہ اسے اپنا سانس بھی بار محسوس ہوتا تھا۔بجلی کی ایک ہلکی سی چمک ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی جو اس نے مہینوں کے غور و فکر کے بعد تیار کیے تھے۔

ایک پہریدار اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔بھئی چلیں اپنی چھولداری کے اندر۔

یہ طوفان بہت خطرناک ہے۔

ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں دوسرے نے جواب دیا۔

کہاں جاتے ہو؟

ذرا جمعدار صاحب کا حال دیکھ آؤں

ایک پہریدار اکبر خاں سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر رک گیا اور دوسرا مرلی دت کی چھولداری کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا چلو بھئی۔جمعدار جی کو اس وقت دنیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ہم اپنی چھولداری کے اندر بیٹھتے ہیں۔یہ کمبخت خود بھینس کی طرح سوتا ہے اور ہمیں ایسی بارش میں بھی سر چھپانے کی اجازت نہیں دیتا۔آخر ان کوٹھڑیوں میں کون سے خزانہ ہے۔جسے کوئی لوٹنے آئے گا۔ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگاتے رہیں گے۔

وہ چلے گئے۔

اکبر خان نے اطمینان کا سانس لیا۔تھوڑی دیر بعد ایک چابی لگ گئی۔س نے تالا نکال کر کنڈی اتار دی اور آہستہ سے کواڑ کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیئے۔

بھائی جان! بھائی! اس نے دبی زبان میں کہا۔

اکبر آہستہ بول! معظم علی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

اکبر خان نے کہا۔پہریدار چھولداری کے اندر چلے گئے ہیںض

میں جانتا ہوں۔آؤ ہمارے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔

اکبر خان نے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔یہ لیجئے۔اگر پہریدار جلد نہ آگئے تو ہم تمام کوٹھڑیاں کھول سکتے ہیں۔

معظم علی نے باہر نکل کر دروازے کو کنڈی لگا دی اور کہا۔اس کا تالا کہاں ہے؟

اکبر نے جواب دے وہ میں نے چھت پر پھینک دیا ہے۔

معظم علی جلدی سے آگے بڑھ کر دوسری کوٹھڑی کا تالا کھولنے میں لگ گیا۔ چند چابیاں آزمانے کے بعد اس نے تالا کھول لیا کوٹھڑی کے اندر اس کے دو ساتھی منتظر تھے۔اس نے چابیوں کے گچھے کی رسی کھینچ کر توڑ ڈالی اور اپنے ساتھویں کو چابیاں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔تم ان چابیوں سے جن کوٹھڑیوں کے تالے کھول سکو وہاں سے قیدیوں کو نکال کر میری کوٹھڑی میں جمع کرو اور دروازے اسی طرح بند کرتے جاؤ۔اور دیکھو ہمیں اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسرے قیدیوں کو بھی یہاں سے نکالنا ہے۔

چند منٹ میں معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کے علاوہ بارہ اور قیدہ اس کی کوٹھڑی میں جمع ہو چکے تھے۔صرف آخری سرے پر تین کوٹھڑیاں باقی تھیں جن کے اندر پانچ پانچ قیدی بند تھے۔

معظم علی نے ایک کوٹھڑی کا تالا ابھی کھولا ہی تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔پہریدار گشت کے لیے آرہے ہیں۔

معظم علی نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور اکبر خاں کا بازو پکڑ کر فوراً داخل ہوگیا قیدی دروازے پر منتظر تھے۔معظم علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے اکبر خاں سے دریافت کیا۔پہریدر کتنے ہیں؟

صرف دو۔اس نے جواب دیا۔

معظم علی نے کوٹھڑی کے قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔تم میں سے تین مضبوط آدمی میرے ساتھ آجائیں۔ہم پہریداروں کو چیخ پکار کا موقع دیئے بغیر اس کوٹھڑی

میں بند کریں گے لیکن یاد رکھو۔تمھاری ذرا سی کوتاہی ہمارا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گی۔

اس کے بعد معظم علی نے دروازہ کھول دیا۔تھوڑی دیر میں پہریداروں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔جوں ہی وہ باتیں کرتے ہوئے کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔معظم علی اچانک آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک کا گلا دبوچ کر کوٹھڑی کے اندر گھسیٹ لایا۔دوسرے آدمی کے منہ سے صرف کیا ہے۔ نکلنے پایا تھا کہ ایک قیدی نے بڑھ کر اس کی گردن دبائی اور باقی دو نے اسے گھونسوں اور مکوں سے ادھ موا کر کے کوٹھڑی کے اندر ڈال دیا۔

تاریکی میں معظم علی کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ نو گرفتاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔کوئی ان کی قمیض پھاڑ کر ان کے منہ میں ٹھونس رہا تھا تو کوئی انکی پگڑیاں اتار کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں مصروف تھا۔اور کوئی لاتوں اور مکوں سے ان کی تواضع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا۔بھائی دیکھنا اندھیرے میں اپنے کسی ساتھی کو نہ مار دینا۔

پہریداروں کی بندوقوں اور تلواروں پر قبضہ کرنے کے بعد معظم علی قیدیوں کو لے کر باہر نکلا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔باقی دو کوٹھڑیوں سے قیدیوں کو نکالنے میں اسے دیر نہ لگی۔ جب تمام قیدی معظم علی کی کوٹھری میں جمع ہو گئے تو اس نے اکبر خاں سے کہا۔اکبر تم نے ہمیں قید سے نکالا ہے۔اب باہر نکالنے کے لیے بھی ہمیں تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔

اکبر خان نے جواب دیا۔حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا ممکن نہیں۔یہاں سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم یا تو پچھلی دیوار میں نقب

لگائیں یا چھت پر چڑھ کر پچھواڑے کی طرف دوسری حویلی میں کود جاءن ۔ پچھواڑے کی حویلی میں غلے کے گودام اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں ۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس پہریدار ہوں گے ۔ ہمارے پاس صرف دو بندوقیں اور دو تلواریں ہیں ۔ میں مرلی دت کی بندوق، تلوار، پستول اور بارود کا تھیلی بھی لا کر آپ کو دے سکتا ہوں ۔لیکن اگر ہم اچانک ان خیموں پر حملہ ک رکے پہریدارون کو مغلوب کر لیں تو ہم چند بندوقیں اور تلواریں حاصل کر سکتے ہیں ۔اس کے بعد ساتھ والی حویلہ کے پہریداروں کو مغلوب کرنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔

معظم علی نے جواب دیا نہیں! ہمارے لیے دوسری حویلی سے ہتھیار حاصل کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ان کوٹھریوں کی چھت زیادہ اونچی نہیں اور ہم باآسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں ۔اکبر خاں! سب سے پہلے تمھاری باری ہے ۔تم میرے ساتھ آؤ ۔

کوٹھڑی سے باہر نکل کر معظم علی نے دیوار کے قریب جھکتے ہوئے کہا۔تم میر کندھے پر سوار ہر کر کھڑے ہو جاؤ۔

اکبر خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی ۔لیکن اس کے ہاتھ چھت کی منڈیر تک نہ پہنچ سکے۔معظم علی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے گھٹنے پکڑ کر اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اکبر منڈیر پکڑ کر چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد معظم علی نے اس طرح ایک اور آدمی کو چھت پر چڑھایا اور پھر باقی تمام آدمیوں کو اسی طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔آن کی آن میں تمام آدمی چھت پر چڑھ گئے ۔ نیچے آخری آدمی معظم علی تھا ۔ دو آدمیوں نے اپنی پگڑیوں کا رسا بنا کر نیچے لٹکا دیا۔معظم علی نے بڑے اطمیان کے ساتھ کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور پگڑیوں

کے سہارے چھت پر چڑھ گیا۔

اس چھت سے آگے دوسری حویلی کے مکانات کے چھتیں قریباً ایک گز نیچی تھیں ۔معظم علی اپنے ساتھیوں کو وہیں رُکنے کا حکم دے کر موسلا دھار بارش میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔دوسری چھت کی منڈیر کے قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے صحن کا جائزہ لیا۔اس حویلی کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔دائیں ہاتھ کی دیورا کے درمیان ایک کشادہ ڈیوڑھی میں ایک مشعل جل رہی تھی جس کی روشنی میں ڈیوڑھی سے آگے ایک چھپر کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔چھپر کے نیچے چند آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔معظم علی نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور وہ آگے بڑھ کر ایک لمبی قطار میں منڈیر کے پیچھے لیٹ گئے۔معظم علی نے پہلے اکبر خاں کو نیچے لٹکایا پھر خود منڈیر کے ساتھ لٹک کر اتر گیا۔تھوڑی دیر میں اس کی تمام ساتھی کسی وقت کے بغیر دوسرے حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔

معظم علی نے باقی آدمیوں کو کو وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور اکبر خان کے علاوہ تین اور شتھیوں کے ہمراہ پانی اور کیچڑ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے روشن حصے کی طرف بڑھا۔چھپر کے نیچے دو چار پائیوں کے درمیان خالی جگہ میں گزر کر یہ لوگ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوئے۔ڈیوڑھی کے اندر دو آدمی کھاٹوں پر اور سات آدمی فرش پر سو رہے تھے۔دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک مشعل جل رہی تھی۔اور اس کے قریب ہی تیل کی کُپی پڑی ہوئی تھی۔بائیں ہاتھ ایک کھاٹ کے سرہانے دیوار کے ساتھ چند بندوقیں اور بارود کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔وہ فرش پر لیٹے ہوئے آدمیوں سے پاؤں بچاتے ہوئے آگے بڑھے اور بندوقیں اٹھا کر دبے پاؤں باہر

نکل آئے۔

معظم علی نے مشعل اٹھائی اور اس پر کپی سے تیل ڈالنے کے بعد واپس مڑا۔ ڈیوڑھی سے چھپر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں چھ آدمی چارپائیوں پر سو رہے ہیں اور ان چارپائیوں سے آگے دونوں طرف چھپر کے نیچے گھوڑوں کھڑکیاں ہیں۔ معظم علی نے مشعل بلند کرکے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا اور آن کی آن میں اس کے ساتھی آگے بڑھ کر ڈیوڑھی کے سامنے جمع ہو گئے۔ چند آدمی معظم علی کے اشارے پر ڈیوڑھی کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں گھوڑے بدحواس ہو کر کھبلی مچا رہے تھے۔ چھپر کے نیچے لیٹے ہوئے تین آدمی یکے بعد دیگرے ہڑبڑا کر اٹھے۔ لیکن معظم علی کے ساتھیوں نے انہیں بندوقوں کے کندوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ ایک پہریدار نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کا گلا دبا دیا۔ ڈیوڑھی کے اندر اور چھپر کے نیچے باقی پہریدار انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں ان غیر متوقع حملہ آوروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے کہا۔ یہ گاؤں ہمارے محاصرہ میں ہے۔ تمھارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اگر کسی نے شور مچانے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم بلا چون و چرا ہمارے حکم کی تعمیل کرو۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھی پہریداروں کو ہانک کے غلے کے ایک گودام میں بند کر چکے تھے۔ معظم علی نے گودام کا دروازہ بند کر رہا تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا بھائی جان حویلی کے پھاٹک میں قفل لگا ہوا ہے۔ آپ ان سے چابی لے لیں۔

چابی کس کے پاس ہے؟ معظم علی نے پہریداروں سے سوال کیا۔

جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو معظم علی نے دوبارہ کہا۔ میں حویلی کی چابی مانگتا ہوں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر چابی ہمارے حوالے نہ کی گئی تو اس گودام کو آگ لگا دی جائے گی۔

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کہے بغیر ایک چابی معظم علی کے ہاتھ میں دے دی۔ معظم علی دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو۔ دو آدمی یہاں دروازے کے پاس کھڑے رہیں اگر یہ لوگ شور مچائیں۔ تو اس حویلی کو آگ لگا دی جائے اور باقی فوراً گھوڑوں پر سوار ہو جائیں۔

حویلی کے صحن میں تین طرف دیواروں کے ساتھ چھپروں کے نیچے کوئی ڈیڑھ سو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے اوپر دیوار پر لگی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ گھوڑوں کی لگامیں اور زینیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق گھوڑے تیار کرنے کے بعد معظم علی کے ساتھیوں نے باقی گھوڑے کھول کر ڈیوڑھی کے سامنے جمع کیے پھر حویلی کا پھاٹک کھول دیا گیا اور وہ گھوڑوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے باہر نکل آئے۔

گھوڑوں کی ٹاپ سن کر گاؤں کے پہریدار بھاگتے ہوئے اس تنگ گلی میں داخل ہوئے لیکن وہ گھوڑوں کے سموں تلے پس کر رہ گئے۔

چند منٹ بعد جب ساتھ والی حویلی کے محافظ بندوقیں چلا کر اور نقارے بجا کر لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ معظم علی اور اس کے ساتھی گاؤں سے باہر مرہٹہ فوج کا پڑاؤ عبور کر رہے تھے اور پھر جب پڑاؤ کے سپاہی اپنے خیموں سے باہر نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ دو تین میل آگے جا چکے تھے۔

مرلی دت حویلی میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا اور لیتے لیٹے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔سپاہی بھاگ کر اس کی چھولداری میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا کیا ہوا؟

کچھ نہیں جناب۔ایک سپاہی نے جواب دیا۔ساتھ والی حویلی سے گھوڑے کھل کر باہر نکل گئے۔

گھوڑے باہر کیسے نکل گئے؟اس نے برہم ہو کر سوال کیا۔

پتہ نہیں کیسے نکل گئے جناب!حویلی کا دروازہ کھلا ہے اور پہریدار کہیں غائب ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑوں کو روکنے کے لیے ان کے پیچھے گئے ہیں۔

کتنے گھوڑے بھاگ گئے ہیں؟

جناب تمام نکل گئے ہیں وہاں ایک بھی نہیں رہا۔

مرلی دت بستر سے اٹھا اور سپاہیوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکل کر بولا۔تم پاگل ہو۔تمام گھوڑے خود بخود کیسے بھاگ سکتے ہیں۔

پھر وہ بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ڈیوڑھی کے سامنے اسے مشعل کی روشنی میں چوکی کا محافظ دکھائی دیا۔

کیا ہوا جناب؟ اس نے ہانپتے ہوئے سوال کیا۔گھوڑے خود بخود کیسے نکل گئے؟

گھوڑے ڈاکو لے گئے ہیں۔

لیکن پہریدار کہاں گئے تھے؟

پہریداروں کو ہم نے ایک کوٹھڑی سے نکالا ہے۔تم اپنے قیدیوں کا خیال رکھو!

جناب قیدیوں کی آپ فکر نہ کریں۔لیکن اتنے گھوڑوں کا نقصان!

مرلی دت کا ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے دو سپاہیوں کے گم ہو جانے کی اطلاع دی۔

مرلی دت نے سوال کیا۔تم نے قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھی ہیں؟

ہاں جناب! وہ تو بند ہیں اور ان میں تالے لگے ہوئے ہیں۔ایک دوسرا سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی جناب قیدی اندر سے کوئی آواز نہیں دیتے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پیچھے کی دیوار میں نقب لگا کر دوسری حویلی میں نہ چلے گئے ہوں۔

مرلی دت نے برہم ہو کر کہا۔قیدی ناخنوں سے ڈیڑھ گز چوڑی دیوار نہیں کھود سکتے وہ صرف ہماری پریشانی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

چوکی کے محافظ نے کہا۔میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد مرلی دت مشعل کی روشنی میں اپنا صندوق خالی دیکھنے کے بعد چلا چلا کر اکبر خاں کو آوازیں دے رہا تھا اور چوکی کا محافظ چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

ایک اور پہریدار بھاگتا ہوا چھولداری میں داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا۔ سرکار غضب ہو گیا۔معظم علی کی کوٹھڑی خالی ہے۔

تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خالی ہے؟ اس نے سراسیمہ ہو کر سوال کیا۔

جناب میں نے ٹٹول کر دیکھا تو اس کا تالا غائب تھا۔صرف کنڈی سے باہر سے بند تھی میں دروزہ کھول کر اندر گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔

مرلی دت نے سراپا فریاد بن کر چوکی کے محافظ کی طرف دیکھا اور کہا۔سرکار چابیوں کا گچھا غائب ہے۔

چوکی کے محافظ نے کچھ کہے بغیر مرلی دت کے بستر سے اس کی بانسری اٹھائی

اور اسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔

○

علی وردی خاں، میدنا پور کے سرکاری محل میں مقیم تھا۔ اور اس کی فوج شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ایک صبح وہ محل کے کشادہ کمرے میں بیٹا اپنے میر منشی کو درخواستوں اور مراسلوں کے جواب لکھوا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ ایک کرسی پ رسراج الدولہ بیٹھا ہوا تھا۔ محل کا داروغہ اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ کر ایک مراسلہ پیش کیا۔

علی وردی خاں، میر منشی کو چند جملے لکھوانے کے بعد داروغہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا۔ عالیجاہ! یہ معظم علی کی درخواست ہے اور وہ اسی وقت قدبوسی کی اجازت چاہتا ہے۔

معظم علی کون ہے؟ علی وردی خاں نے مراسلہ لکھواتے ہوئے سوال کیا۔

داروغہ نے جواب دیا۔ عالیجاۃ! یہ وہی نوجوان ہے جسے حضور نے سرحدی علاقوں کا محافظ مقرر کیا تھا وہ مدت سے لاپتہ تھا اور اب مرہٹوں کی قید سے فرار ہر کر یہاں پہنچا ہے۔

علی وردی خاں نے جلدی سے مراسلہ کھول کر پڑھا اور دوراغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا اسے فوراً حاضر کرو!

داروغہ سلام کر کے باہر نکل گیا اور علی وردی خاں کی نگاہیں دوبارہ مراسلے پر مرکوز ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ علی وردی خاں نے اٹھ کر اس کے ستھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور سراج الدولہ نے اس کی تقلید کی۔ علی وردی خاں نے کہا ہم تمھارے متعلق مایوس ہو چکے تھے۔ بیٹھو، اور مجھے اپنی سرگزشت سناؤ!

معظم علی، علی وردی خاں نے کہا۔کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ تم میر حبیب کی قید میں ہو۔تمھاری گرفتاری یقیناً عطاءاللہ خاں کی سازش کا نتیجہ تھی۔وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے۔ہم اسے **ملک بدر** کر چکے ہیں۔

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری تنہا عطاءاللہ خاں کی سازش کا نتیجہ نہ تھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔

علی وردی خاں نے جواب دیا۔سازش درحقیقت ہمارے خلاف تھی اور عطاء اللہ خاں کے جن ساتھیوں پر ہمیں شبہ تھا وہ سب فوج سے نکالے جا چکے ہیں۔میر جعفر نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کے دل میں عطاءاللہ خان کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے اور انہوں نے تمہیں فوج کی حفاظت کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا تھا۔

عالیجاہ! انہوں نے مجھے منع ضرور کیا تھا۔لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ابتداء سے ہی عطاءاللہ خاں کا رازدار نہیں تھے۔

علی وردی خاں نے قدرے آزمودہ ہو کر جواب دیا۔اگر وہ عطاءاللہ خاں کے رازدار بن کر ہمیں بروقت اس کے ارادوں سے باخبر نہ کرتے تو اڑیسہ میں ہمیں انتہائی خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔بہرحال اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری گرفتاری کے صحیح اسباب معلوم کیے جائیں تو یہ مشکل نہیں۔ہم میر حبیب سے تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔میر حبیب نے ہمارے ساتھ صلح کی درخواست کی ہے اور ہم صلح کی شرائط کرنے کے لیے میر جعفر کی سرکردگی میں ایک وفد اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔

معظم علی نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔آپ میر حبیب سے صلح کرنا چاہتے ہیں؟

ہاں! ہم اڑیسہ پر مرہٹوں کے پے در پے حملوں سے تنگ آ چکے ہیں۔میر

حبیب بعض شرائط پر اڑیسہ کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے اس کے ایلچی دوبار ہمارے پاس آ چکے ہیں۔میر جعفر کا خیال ہے کہ وہ ہماری ملازمت اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔اگر میر جعفر نے اسے رام کرلیا تو ہم اسے بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔مرہٹوں کے ساتھ نپٹنے کے لیے اس سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ہوسکتا۔تم نہایت وقت پر آئے ہو اور میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے تمہیں بھی میر جعفر کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔

معظم علی کچھ حیرت و استعجاب کے عالم میں علی وردی خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔عالیجاہ!اگر گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کروں!

کہو!

میر حبیب جیسے لوگوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں تلوار کی زبان کی ضرورت ہے۔میں بھیڑیوں سے بھیڑوں کی حفاظت کا کام لینے کی منطق کا قائل نہیں۔میں میر حبیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔وہ ایک غدار ہے اور ایک غدار پر دوبارہ اعتماد کرنا پرلے درجے کی خودفریبی ہوگی،اگر وہ صرف آپ کا دشمن ہوتا تو آپ اس کا ماضی فراموش کرنے میں حق بجانب ہوتے۔لیکن وہ آپ کی حکومت سے زیادہ بنگال کے باشندوں کی عزت و آزادی اور بقا کا دشمن ہے اور بنگال کا کوئی مُحِبِ وطن اس کا ماضی فراموش کرنے میں غلطی نہیں کرے گا۔

میں آپ کی فوج میں ایسے شامل ہوا تھا کہ میں اپنے دل میں بنگال کی عزت اور آزادی کے لیے ایک تڑپ محسوس کرتا تھا۔میرے ساتھیوں نے آپ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے اگر اپنا خون پیش کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کے دشمنوں کا بنگال کا دشمن اور بنگال کی دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔اب اگر آپ نے اپنا نظریہ

بدل لیا ہے تو ایسے لوگوں کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ جو اپنے خون کی روشنائی سے قوم کی آزادی کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔

علی وردی خاں نے کہا۔ کاش قوم میں تمھارے جیسے چند اور نوجوان ہوتے۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں ہمارے مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں بیک وقت اُن ان گنت طالع آزماؤں کے ساتھ کیسے نمٹ سکتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حکومت کی مسند کا واحد حقدار سمجھتا ہے۔ موجودہ حالات میں میر حبیب کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانا میرے لیے ایک مجبوری ہے۔

معظم علی نے جواب دیا۔ آپ اس لیے مجبور رہیں کہ آپ حکومت کا کاروبار چلانے یا ہنگامی حالات سے عہدہ بر آہونے کے لیے چند طالع آزماؤں کے درمیان توازن قائم رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان جاہ پسندوں میں سے کسی کو بھی قوم کی عزت اور آزادی کا امین نہیں سمجھتا۔ میں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ قوم کی اجتماعی قوت مدافعت ہی ہماری بقا اور آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہ ابن الوقت یہ غدار یہ اقتدار کی مسندوں کے لیے بے حیا دعویدار، عوام کی بے حسی، بد دلی اور مایوسی کی پیداوار ہیں۔ اور میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سودا کرنے کی بجائے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار کریں۔ یہ وہ ناسور ہیں۔ جنھیں کاٹ کر جڑ سے نکالے بغیر ایک صحت مند قوم کی تخلیق ممکن نہیں۔ اور جو حکومت ایک صحت مند قوم کی تخلیق سے قاصر رہتی ہے اس کے لیے گھر کی غدار بیرونی حملہ آوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

علی وردی خاں نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔ نوجوان تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ میر حبیب کے خلاف تمہارے غم و غصہ کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں

لیکن موجودہ حالات میں ہمیں اس کی دشمنی کی بجائے اس کی دوستی کی ضرورت ہے ۔

معظم علی نے جواب دیا ۔میر جبیب کی دوستی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک معمولی سپاہی کی ضرورت نہیں ۔ اگر موجودہ حالات مجھے ایک حقیقت پسند انسان بننے سے منع کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری قسمت کے امین دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں ۔اب مجھے اجازت دیجئے ۔

معظم علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا ۔

علی وردی خاں چند ثانیے غصے اور غصے سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں معظم علی کی طرف دیکھتا رہا ۔ بالاخر اس نے کہا ۔ معظم علی ! میں اپنی تلوار کا لوہا پہچانتا ہوں ۔تمھارا استعفا منظور نہیں کیا جائے گا ۔ایک طویل عرصہ مرہٹوں کی قید میں رہنے کے بعد تم چھ ماہ کی رخصت کے حق دار ہو ۔اور مجھے یقین ہے کہ تم اس عرصہ میں یہ سمجھ سکو گے کہ میرا یہ اقدام صحیح تھا ۔مرہٹوں میں پھوٹ ڈالنے کی لیے میر حبیب کو قابو میں لانا ضروری ہے ۔اب تم جا سکتے ہو ۔

معظم علی باہر نکل گیا اور علی وردی خاں سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا ۔

سراج الدولہ نے کہا ۔ جہاں پناہ ! گستاخ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد شاید ہماری فوج میں دوبارہ آنا پسند نہ کرے ۔

علی وردی خاں مسکرایا ۔وہ محمود علی کا بیٹا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر ہمیں کسی محاذ پر جانا پڑے تو ہو گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند

کرے گا۔تم جاؤ اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو۔کسی دن وہ تمھارے ترکش کا بہترین تیر ثابت ہوگا۔

سراج الدولہ نے کہا۔تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے؟

علی وردی خاں نے مغموم لہجے میں کہا۔خفا؟ ایک بوڑھا اپنی لاٹھی سے ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرمانروا اپنے عصائے حکمرانی سے کیونکر خفا ہوسکتا ہے۔ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بول رہا تھا تو میں نے آگے بڑھ کر سینے سے کیوں نہ لگا لیا۔کاش! میرے اسلحہ خانے میں اس قسم کی تلواریں اور بھی ہوتیں اور میں ہر محاذ پر ہر دشمن کو للکار سکتا۔لیکن جب تمھارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ بنگال کے حالات اس سے مختلف ہوں گے۔معظم علی جیسے نوجوانوں کی دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی۔تم جاؤ اور بخشی سے کہو کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کے زمانے کی پوری تنخواہ ادا کردی جائے۔ہم ایک ہفتہ تک مرشد آباد پہنچ جائیں گے۔ اور وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے تمھاری محافظ فوج کا کماندار مقرر کردیا جائے

۔

سراج الدولہ کمرے سے نکلا اور محل کے دروازے پر معظم علی سے جا ملا اور اس نے اسے آواز دے کر روکتے ہوئے کہا۔مجھے اپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں

ملا۔

فرمایئے۔! معظم علی نے کہا۔

سراج الدولہ نے کہا میں یہاں سیدھا ہگلی جا رہا ہوں اور شاید کچھ عرصہ مرشد آباد نہ آسکوں۔اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مستعفی ہونے کے متعلق اپنا

ارادہ تبدیل کر سکیں تو سیدھے میرے پاس آئیں مجھے وہاں اپنی فوج کے لیے قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے۔

آپ مجھے قابل اعتماد سمجھتے ہیں؟ معظم علی نے مسکرا کر سوال کیا۔

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ اگر میں آپ کو قابل اعتماد نہ سمجھتا تو دوڑتا ہوا آپ کے پیچھے نہ آتا۔ چلیے ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

معظم علی اس کے ساتھ محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا اور وہ قریباً دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت سراج الدولہ نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ کیا میں یہ توقع رکھوں کہ چند دنوں میں یا چند ہفتوں کے بعد آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا۔ میں آپ سے صرف یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مستعفی ہونے کے متعلق میں نے اپنا ارادہ تبدیل کیا تو کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔

سراج الدولہ نے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا ارادہ بہت جلد بدل جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی بارہ سواروں کے ہمراہ مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا۔ اور ان میں سے آٹھ وہ تھے جو معظم علی کے ساتھ قید ہوئے تھے۔ باقی راستے کی مختلف منازل پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

میدنا پور چند گھنٹے قیام کے دوران میں معظم علی پانے اور مرزا حسین بیگ کے گھر کی خیریت معلوم کر چکا تھا۔ اس کے محلے کا ایک سپاہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اس کا باپ مرشد آباد میں ہے۔ اس کا بھائی یوسف اس کی روپوش ہونے کے بعد عظیم آباد سے مرشد آباد آ گیا تھا۔ اور اب میر مدن نے ڈھاکہ کی فوجداری سنبھالنے کے بعد

اسے اپنے پاس بلا لیا ہے۔افضل بیگ مرشد آباد میں ہے۔

مرشد آباد سے میر مدن کی تبدیلی کی خبر اس کے لیے پریشان کن تھی۔لیکن فوج کے ایک افسر سے تبادلہء خیالات کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ میر مدن نے مرشد آباد کے بعض امراء بالخصوص میر جعفر سے شدید اختلافات کے باعث،علی وردی خاں سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔

آٹھواں باب

آمنہ بالا خانے کے ایک کمرے میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھ رہی تھی کہ صابر بھاگتا ہوا زنانہ مکان کے صحن میں داخل ہوا اور پوری طاقت کے ساتھ چلانے لگا۔ معظم علی آ گیا۔ معظم علی آ گیا۔

آمنہ قرآن بند کر کے اٹھی، لیکن اس میں بولنے یا چلنے کی ہمت نہ تھی۔ نیچے خادمہ، صابر کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ کہاں ہے معظم علی؟ خدا کے لیے بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر بالا خانے کی طرف منہ اٹھا کر بدستور چلا رہا تھا۔ بی بی جی! بی بی جی! معظم علی آ گیا۔

معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا اور خادمہ بھاگ کر بالا خانے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ بی بی جی! معظم علی۔۔۔۔۔۔اس نے پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

آمنہ لڑکھڑاتی ہوئی دریچے کی طرف بڑھی۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھا۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا اور وہ ایک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

امی جان میں آ گیا ہوں۔ معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

میرا لال۔ میرا بیٹا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ معظم علی بے اختیار ماں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آمنہ اب بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کر رہی تھی۔

میرے چاند۔ میرے لال! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔ میں ہر روز تمہیں

خواب میں دیکھا کرتی تھی۔

ابا جان کہاں ہیں؟ معظم علی نے سوال کیا۔

وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ کہہ کر آمنہ خادمہ کی طرف متوجہ ہوئی جو دروازے میں کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ تم جلدی سے ناشتہ تیار کرو اور صابر سے کہو ان کے ابا جان کو اطلاع دے دے۔

صابر جا چکا ہے۔ خادمہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

ماں اور بیٹا قالین پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ تم کہاں تھے بیٹا؟

امی جان میں مرہٹوں کی قید میں تھا۔ معظم علی یہ کہہ کر اٹھا اور دریچے کے قریب جا کر آواز دی۔ اکبر خان! تم نیچے کیوں کھڑے ہو اوپر آ جاؤ!

اکبر خان کون ہے؟ ماں نے سوال کیا۔

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا۔ امی جان آپ کے لیے ایک اور بیٹا لایا ہوں۔ وہ میرے ساتھ قید تھا اور میں اسی کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔

اکبر خاں جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے معظم علی کی ماں کو سلام کیا۔

آمنہ نے جواب دیا۔ جیتے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھ جاؤ!

کوئی دس منٹ بعد نیچے صحن سے محمود علی کی آواز آئی۔ کہاں ہے معظم علی؟

معظم علی اٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بے اختیار اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالا خانے کے اسی کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی

مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی، ماں اور باپ کے ان گنت سوالات کے جواب میں اپنی سرگذشت سنا رہا تھا۔

صابر نے سیڑھیوں سے آواز دی۔ مرزا حسین بیگ آئے ہیں۔

انہیں اوپر لے آؤ۔ محمود علی نے کہا۔

ان کے ساتھ اور آدمی بھی ہیں۔ صابر نے جواب دیا۔

اچھا انہیں دیوانخانے میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔

جب معظم علی اور اس کا باپ نیچے اترنے لگے تو اکبر خان ان کے پیچھے ہولیا۔

آمنہ نے کہا۔ تم کہاں جاؤ گے بیٹا تم یہیں بیٹھو۔ میں تم سے تمام واقعات سننا چاہتی ہوں۔

مرزا حسین بیگ اور محلے کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد معظم علی واپس آیا تو اکبر خاں قالین پر پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ خادمہ ناشتہ لے کر آئی تو معظم علی، اکبر خاں کو جگانے لگا لیکن ماں نے کہا۔ بیٹا اسے نہ جگاؤ میں اسے ناشتہ کھلا چکی ہوں۔

محمود علی نے جلدی سے ناشتا کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ معظم! مجھے آج دفتر میں چند ضروری کام ہیں۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ اتنی دیر میں تم اپنی ماں سے باتیں کرو۔ میں یوسف کو ابھی پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ بھی ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر آجائے۔

محمود علی کے جانے کے بعد معظم دیر تک اپنی ماں کے مختلف سوالات کا جواب دیتا رہا۔ بالآخر اس نے پوچھا۔ امی جان! فرحت اور اس کی امی کیسی ہیں؟

وہ بہت خوش ہیں بیٹا۔ ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

کیا ہوا امی جان؟ معظم علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

کچھ نہیں بیٹا! ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ تم مرزا صاحب سے مل آئے ہو نا؟

ہاں امی جان! لیکن افضل مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مرزا صاحب کہتے تھے وہ کل شکار پر چلا گیا ہے میرا خیال ہے میں چچی جان کو سلام کر آؤں۔

ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔

معظم علی نے پوچھا۔ امی جان فرحت کی امی آپ سے ملا کرتی ہیں نا؟

ہاں بیٹا! کبھی میں ان کے یہاں چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ ہمارے یہاں آجایا کرتی ہیں۔ پہلے فرحت بھی ان کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے وہ گھر سے نہیں نکلتی۔

امی جان! کیا بات ہے، آپ مغموم کیوں ہو گئیں؟

کچھ نہیں بیٹا! ماں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ کاش تم دو مہینے پہلے آجاتے۔

اور معظم علی انتہائی اضطراب کی حالت میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ بیٹا! فرحت کی منگنی ہو چکی ہے۔

ایک ثانیے کے لیے معظم علی نے محسوس کیا کہ کائنات کے نظام میں یکا یک ٹھہراؤ آگیا ہے اور زمانے کی ایک ٹھوکر نے اسے امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور ولولوں کے حسین اور سدا بہار نخلستانوں سے نکال کر ایک بے ادب و گیاہ صحرا کی بھیانک وسعتوں میں پھینک دیا ہے۔

فرحت کی منگنی ہو چکی ہے۔ یہ چند الفاظ معظم کے لیے حال اور مستقبل کی اس

داستان کاعنوان تھے جونغموں، مسکراہٹوں اور قہقہوں سے خالی تھی۔وہ رنگین سپنوں، دلفریب نظاروں اور دلکش نغموں کی حسین وادیوں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔جس کی صبحیں سورج کی ضیاء پاشیوں سے اور جس کی راتیں ستاروں کی مسکراہٹوں اور چاند کے قہقہوں سے محروم تھیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔لیکن ماں کے لیے یہ مسکراہٹ ہزاروں آنسوؤں سے زیادہ دردناک تھی۔معظم نے سنبھل کر کہا۔امی جان آپ فرحت کی منگنی پر خوش نہیں ہیں؟

اور ماں نے جواب دینے کی بجائے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

بیٹا!اس نے اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔مرزا حسین بیگ کوتمھارا بہت خیال تھا۔لڑکے والے کئی بار ان کے یہاں آئے لیکن وہ ہر بار انکار کرتے رہے پھر جب وہ تمھارے متعلق مایوس ہوگئے تو انہوں نے ہاں کردی۔ اس بات کوایک مہینہ ہوا ہے میں منگنی کی دن ان کے ہاں گئی تھی۔شہر کے امراء کی بیویاں وہاں جمع تھیں۔میں نے جب فرحت کومبارک باد دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کہا۔بہن خدا کی منظور نہ تھا۔ورنہ مرزا صاحب یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ فرحت آپ کی ہے۔اب آپ میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔اس کے بعد جب میں نے عدا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو یہ محسوس کررہی تھی کہ فرحت میری بیٹی ہے اور وہ نوجوان جس کے ساتھ اس کی منگنی ہورہی ہے صرف عابدہ کا ہی نہیں بلکہ میرا بھی داماد ہے۔

جس وقت ماں بیٹے آپس میں باتیں کررہے تھے۔فرحت اپنے مکان کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔اس کی ایک بے تکلف سہیلی جس کا نام ناصرہ تھا۔

کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دبے پاؤں فرحت کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کرلیں اور کہا۔ بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟

چھوڑو ناصرہ مجھے تنگ نہ کرو۔ فرحت نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

غلط! بالکل غلط! ناصرہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں ناصرہ نہیں ہوں، میں معظم علی ہوں۔ سنتی ہو میرا نام معظم علی ہے۔

ناصرہ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔ اس نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا۔

ناصرہ قدرے نادم سی ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فرحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز دیکھ کر اس نے کہا۔ فرحت تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارے ابا جان اب اپنا خیال بدل دیں گے۔

ناصرہ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔ میں ابا جان کو سارے ملک میں رسوا کرنے کی بجائے اس مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دینا آسان سمجھتی ہوں۔

لیکن معظم علی آگیا ہے اب حالات بدل چکے ہیں

فرحت نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ معظم علی آگیا ہے لیکن فرحت اس کے لیے مر چکی ہے۔ فرحت اس دن مر گئی تھی جس دن اس کی منگنی کا جوڑا پہنا تھا اور اب میرے والدین مجھے معظم علی کے لیے قبر سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے

۔

○

معظم علی کے دل میں تنہائی اور بے کسی کا احساس بڑھتا گیا۔ گھر سے باہر مرشد آباد کی گلیاں اسے اداس نظر آتی تھے کبھی کبھی وہ حسین بیگ کے پاس جاتا۔ حسین بیگ اس کے ساتھ انتہائی سفقت سے پیش آتا۔ اس کے ساتھ افضل کا برتاؤ بھی

نہایت دوستانہ تھا۔لیکن معظم علی ہر ملاقات کے بعد اپنے دل پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوا گھر واپس آتا۔پانچ دن بعد یوسف علی آیا اور دو دن گھر رہ کر واپس چلا گیا۔

قید سے فرار ہونے کے بعد اس نے اکبر خان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشد آباد پہنچتے ہی میں تمہیں روہیلکھنڈ پہنچانے کا انتظام کر دوں گا۔اور اکبر خاں نے جب دس دن اس کے گھر ٹھہرنے کے بعد اپنے وطن جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا۔اکبر خاں تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے میں خود تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔

اکبر خاں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا بھائی جان! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں چند ہفتے اور یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔

چوتھے روز علی الصباح معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ روانہ ہوا۔چند دن سفر کرنے کے بعد وہ اودھ کی سرحد سے دس میل دور رہیلکھنڈ کے چرواہوں اور کسانوں کی چند بستیاں عبور کرنے کے بعد ایک ٹیلے پر گھوڑے روک کر اپنے سامنے ایک سرسبز و شاداب وادی دیکھ رہے تھے اکبر خاں نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔وہ میرا گاؤں ہے۔

پھر وہ ٹیلے سے اتر کر کچھ دیر ایک گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں داخل ہوئے اور اکبر خاں نے کہا۔یہ ہماری زمین ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں میں داخل ہوئے اور آن کی آن میں گاؤں کی خاموش گلیاں اکبر خان آ گیا۔اکبر خاں آ گیا! کے نعروں سے گونج اٹھیں۔بچے، بوڑھے اور جوان ان کے گرد جمع ہو گئے۔وہ گھوڑوں سے اتر پڑے گاؤں کا ہر شخص اکبر خاں کو دیکھنے اس سے بغلگیر ہونے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے بیقرار تھا۔تھوڑی

دیر بعد یہ ہجوم ایک قلعہ نما مکان کے سامنے رکا اور اکبر خاں نے معظم علی سے کہا۔ بھائی جان یہ ہمارا گھر ہے۔

ایک خوش وضع نوجوان دروازے سے نمودار ہوا اور لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر اکبر خاں سے لپٹ گیا۔ یہ اکبر خاں کا بڑا بھائی اظہر خاں تھا۔

چند دن بعد معظم علی اس علاقے کے کسی آدمی کیلئے اجنبی نہ تھا۔ اکبر خاں کے قبیلے کا ہر بچہ بوڑھا اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ اظہر خاں جو اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کا سردار تھا۔ معظم علی کا بے تکلف دوست بن گیا تھا۔

یہ گاؤں اور اس کے اردگرد دس بستیاں بنگش افغانوں کے لوگوں سے آباد تھیں اور وہ سب اکبر خاں کے خاندان کی سرداری تسلیم کرتے تھے۔ روہیلکھنڈ کے دوسرے افغانوں کی طرح یہ لوگ اچھے کاشت کار اور چرواہے ہونے کے علاوہ بہترین سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بیرونی حملہ آوروں، بالخصوص مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے ہر روہیلہ نوجوان نشانہ بازی، تیغ زنی اور شہسواری میں کمال حاصل کرنا، اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ جب ہندوستان کے باقی علاقوں کو بے حیا سیاشاطروں اور حریص قسمت آزماؤں نے نکبت و افلاس کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی محنت و مشقت سے فراغت اور خوشحالی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مصروف تھے اور جب بڑے بڑے صوبوں کی عیش پرست حکمرانوں کی افواج اپنی رعایا کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچانے سے قاصر تھیں۔ یہ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو رہے تھے۔

معظم علی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرنے کی نیت سے آیا تھا۔ لیکن اس نے تین مہینے یہاں گذار دیئے۔ ابتدا میں کبھی کبھی وہ اظہر خاں اور اکبر خاں کے ساتھ

شیر کا شکار رکھیلنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب شکار سے اس کا جی بھر گیا تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تیر اندازی، نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

تین ماہ بعد جب وہ اطہر خاں اور اکبر خاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں سے جدا ہو رہا ہے۔ اطہر، اکبر اور علاقے کے چند اور آدمی اودھ کی سرحد تک سے چھوڑنے کے لیے آئے۔ اکبر خان کے ساتھ جب وہ مصافحہ کر رہا تھا تو اس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ بھائی جان، آپ پھر کب آئیں گے؟

مجھے معلوم نہیں، اکبر خاں! ہوسکتا ہے کہ میں ہمیشہ کیلئے تمھارے پاس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے بعد ہم اس زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔

اکبر خاں سے رخصت ہو کر معظم علی نے آگرہ اور دلی کا رُخ کیا۔ دلی سے واپسی پر کچھ عرصہ لکھنو ٹھہرا اور بالآخر اپنے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کی دلخراش داستانیں لیے گھر پہنچا۔

O

گھر میں معظم علی کو سکون نصیب نہ ہوا کچھ عرصہ ہو بیکاری کے لمحات کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا رہا۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کی طعیت کتابوں سے بھی اچاٹ ہو گئی۔

ایک دن اس کا بھائی یوسف علی رخصت پر گھر آیا اور ایک ہفتہ رہ کر واپس چلا گیا۔ جب معظم علی کے رخصت کے دن ختم ہونے کے قریب آرہے تھے تو اس نے چند بار استعفا لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تو اس کی قوت فیصلہ جواب دے جاتی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سراج الدولہ مرشد آباد آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔ کہیے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟

معظم علی نے جواب دیا۔ میں چند دنوں سے ہگلی پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

سراج الدولہ نے کہا۔ میری یہ خواہش ہے کہ ہگلی کے قلعے کی کمان آپ کے سپرد کر دی جائے۔ میں ایک ہفتہ تک واپس جا رہا ہوں۔ اس لیے آپ تیار رہیں۔

معظم علی نے جواب دیا اگر ہگلی کے قلعے کے لیے آپ میری ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ انتظار کرنے کی بجائے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔

بہت اچھا! شام تک آپکے پاس میرا حکم نامہ پہنچ جائے گا۔

اگلے دن علی الصباح معظم علی ہگلی کا رخ کر رہا تھا اور چند دن بعد ہگلی کے قلعے کے آرام طلب سپاہی اور افسر ایک دوسرے سے شکایت کر رہے تھے کہ نیا کماندار ہمیں ایک لمحے کیلئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

معظم علی ایک سال بعد چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا تو معلوم ہوا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے والدین اور مرزا حسین بیگ کی یہ خواہش تھی کہ وہ شادی کی تاریخ تک واپس نہ جائے۔ چنانچہ اس نے سراج الدولہ کو لکھا کہ مجھے تین ہفتے اور مرشد آباد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس خط کا جواب آنے سے پہلے اڑیسہ میں ایک نئے انقلاب کی خبر آ گئی اور وہ یہ تھی کہ مرہٹوں نے اچانک حملہ کر کے میر حبیب کو، جسے علی وردی خاں نے مرہٹوں سے مصالحت کی خاطر کٹک کا فوجدار تسلیم کیا تھا، قتل کر دیا ہے اور ان کی افواج اڑیشہ کے بیشتر اضلاع

پر قابض ہو چکی ہیں۔

معظم علی کو اپنے باپ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ علی وردی خاں نے مرشد آباد کی فوج کو کوچ کی تیاری کا حکمدیا ہے اور ڈھا کہ اور ہگلی کے فوجداروں کو یہ فرمان بھیجا ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنی افواج لے کر اڑیسہ کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر ہگلی کا رخ کیا۔

دو ہفتوں کے بعد ہگلی اور مرشد آباد کی فوج کٹک سے چند منزل دور پڑاؤ ڈال کر ڈھا کہ سے میر مدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمود علی اور افضل بیگ، مرشد آباد کی فوج کیساتھ آئے تھے۔ پانچ دن بعد میر مدن بھی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب میر مدن کی فوج پڑاؤ میں داخل ہوئی تو فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ میر مدن نے گھوڑے سے اتر کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب معظم علی کی باری آئی تو اس نے کہا۔ معظم علی! تمہیں دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی ہے۔ میں سراج الدولہ سے ملنے کے بعد تمہارے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں گا۔

میر مدن ایک افسر کی رہنمائی میں سراج الدولہ کے خیمے کی طرف بڑھا اور افضل نے جو چند قدم دور کھڑا تھا معظم علی کو آواز دی۔ معظم علی! تمھارے بھائی جان بھی آ گئے ہیں۔

کہاں ہیں وہ؟ معظم علی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

وہ دیکھو۔ افضل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف علی کوئی تیس قدم دور لشکر کے چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ معظم علی اور افضل تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یوسف علی نے اس کے ساتھ

یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا۔اچانک افضل کو معظم علی کے پیچھے ایک اور نوجوان دکھائی دیا جو اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

افضل نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔آپ یہاں کیسے آئے۔

میں ڈھاکہ کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔نوجوان نے جواب دیا۔

افضل نے کہا۔مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہو چکے ہیں

نوجوان نے قدرے ازردہ ہو کر جواب دیا۔اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں اپنے ساتھ دو سو رضا کار بھی لایا ہوں۔

معظم علی نے دبی زبان میں یوسف سے پوچھا۔بھائی جان یہ کون ہیں؟

یہ شوکت بیگ ہیں۔جن کی افضل کی ہمشیرہ کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔ا

افضل نے شوکت بیگ کو معظم علی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔یہ معظم علی ہیں۔یوسف علی کے چھوٹے بھائی۔

شوکت بیگ نے آگے بڑھ کر معظم علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔میرا نام شوکت بیگ ہے۔آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔

شوکت بیگ کھلتے ہوئے رنگ کا ایک قوی الجثہ نوجوان تھا اور چہرے سے اس کی عمر کوئی پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، محمود علی، یوسف، افضل اور مرزا شوکت بیگ ایک خیمے میں بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔اب تک معظم علی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ شوکت بیگ ڈھاکہ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے اور میر مدن کی فوج

کے ساتھ اس کی آمد اس کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ لیکن یوسف علی سے استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ذاتی فوج کے دو سو سپاہیوں کے ساتھ ایک رضا کار کی حیثیت میں میر مدن کے ساتھ آیا ہے۔ معظم علی کے نزدیک اس کا یہ جذبہ قابل قدر تھا اور اس نے شوکت بیگ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مرزا صاحب! آپ بنگال کی امراء کے لیے ایک بہت اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ ورنہ اب تو حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں اجتماعی خطرات کا احساس تک باقی نہیں رہا۔

شوکت بیگ نے جواب دیا۔ اجتماعی خطرے کا مجھے بھی کچھ زیادہ احساس نہیں تھا میں نے صرف آپ کی تقلید کی ہے۔ جب مرشد آباد پر حملہ ہوا تھا اور میں نے یہ سنا تھا کہ آپ نے اپنے محلے کے چند رضا کاروں کے ساتھ مرہٹوں کی ایک منظم فوج کے دانت کھٹے کر دیے تھے تو میرے دل میں بھی اپنے مزارعین کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر ایک دفعہ جب مرزا حسین بیگ ہمارے یہاں تشریف لائے اور انہوں نے آپ کے شاندار کارنامے کی بے حد تعریف کرنے کے بعد مجھے بھی تبلیغ کی تو میرا خیال پختہ ہو گیا۔ ہمارا گھر ڈھاکے سے پندرہ میل دور ہے۔ مرزا صاحب اپنے خطوط میں بار بار تاکید کرتے تھے کہ ہمارے مکان کے گرد ایک مضبوط فصیل اور ایک گہری خندق کا ہونا ضروری ہے اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مرزا صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

رات کا وقت جب معظم علی کو تنہائی میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا۔ بھائی جان مجھے تو مرشد آباد میں یہ معلوم ہوا تھا

کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے؟

یوسف نے جواب دیا۔فرحت کی شادی اس مہم کے اختتام تک کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے ۔مرزا حسین بیگ نے اڑیسہ کے حالات کی اطلاع ملتے ہی شوکت بیگ کے والد کو لکھا تھا کہ افضل فوج کے ساتھ اڑیسہ کی مہم پر جا رہا ہے ۔اس لیے میری خواہش ہے کہ جب تم ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے فرحت کی شادی ملتوی کر دی جائے ۔شوکت بیگ غالباً مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے کوئی بڑا کارنامہ سر انجام دینا چاہتا ہے ۔اسی لیے یہ میر مدن کے ساتھ آ گیا ہے ۔

معظم علی نے سوال کیا۔آپ اس سے کب متعارف ہوئے ؟

اس نے خود ہی ڈھاکہ میں تلاش کیا تھا۔ایک دن یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا ۔ مجھے مرزا حسیب بیگ نے لکھا ہے کہ میں آپ سے ملوں ۔شوکت بیگ اچھا آدمی ہے ۔ایک دن یہ مجھے اپنے گھر بھی لے گیا تھا۔ان کا خاندان بہت با اثر ہے اور میر مدن کے ساتھ اس کے والد کے نہایت دوستانہ تعلقات ہیں ۔

○

چند ہفتے بنگال اور مرہٹہ افواج کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتیں رہیں ۔پھر مرہٹہ سپہ سالار جانو جی نے ایک شدید حملہ کے بعد بنگال کی فوج کو میدنا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا ۔ بنگال کی فوج اب میدنا پور کو اپنا مستقر بنا کر اڑیسہ کی شمالی سرحد کے آس پاس مرہٹوں کے اکا دکا حملے روکنے پر اکتفا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاریاں بھی کر رہی تھی ۔پھر اچانک ایک دن یہ اطلاع آئی کہ مرہٹوں کے ساتھ بعض افغان سرداروں کے ساز باز کے باعث بہار کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے ۔اس لیے علی وردی خاں نے مرہٹہ سپہ سالار جانو جی کے

ساتھ جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر کے لشکر کو واپس بلا لیا۔

فوج کا کوئی سپاہی یا افسر اڑیسہ کا صوبہ اس طرح جانوجی کے حوالے کر دینے پر خوش نہ تھا۔لیکن شوکت بیگ کیلئے یہ خبر انتہائی ناقابلِ برداشت تھی ۔میر مدن نے اسے شروع سے چند جنگی قیدیوں کی نگرانی سونپ رکھی تھی اور اسے انتہائی کوشش کے باوجود کسی معمولی لڑائی میں بھی اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔وہ لشکر کی واپسی کی خبر سنتے ہی انتہائی غم وغصہ کی حالت میں میر مدن کے خیمے میں داخل ہوا اور اس پر برس پڑا ۔میر صاحب میں یہاں مکھیاں مارنے نہیں آیا تھا۔میرے آدمی گھر جا کر مذاق اڑائیں گے۔

میر مدن مسکرایا۔میرے خیال میں تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی ۔ کوئی سالار اشد ضرورت کے بغیر ناتجربہ کار رضاکار کو کسی مہم پر نہیں بھیج سکتا اور تمہیں معلوم ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ اکادکا جھڑپوں میں ہم نے صرف نہایت آزمودہ کار دستے بھیجے تھے۔اگر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی تو تمہیں یقیناً اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔

معظم علی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔آپ نے مجھے بلایا ہے؟

ہاں مجھے تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بہار کی مخدوش حالات کے پیشِ نظر اڑیسہ کے متعلق جانوجی کے ساتھ تصفیہ کر چکے ہیں۔لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مرہٹے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہیں گے ۔ بہار کی جانب مغربی علاقوں کی ان کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کے لیے سراج الدولہ کی نگاہ انتخاب تم پر پڑی ہے ۔اب اڑیسہ کی بجائے بہار کی جنوب مغربی سرحد کا آخری قلعہ تمھارا مستقر ہوگا۔وہاں اس وقت تک اطراف کی کئی بستیاں مرہٹہ لیٹروں کے ہاتھوں تباہ

ہو چکی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا۔میر صاحب میں اس مہم میں معظم علی کا ساتھ دوں گا!

میر مدن نے جواب دیا۔نہیں، میں ایک رضا کار کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتا۔

شوکت بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔میں آپ کے سامنے حلف اٹھاتا ہوں کہ جب تک معظم علی اس مہم سے فارغ ہو کر گھر نہیں جاتا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔

معظم علی نے کہا۔میں آپ کی ضد کی وجہ نہیں سمجھ سکتا۔اگر جانوجی کے ساتھ کوئی مصالحت ہو چکی ہے تو اس علاقے میں کسی باقاعدہ جنگ کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔جنگل میں بکھرے ہوئے لٹیروں اور رہزنوں سے نپٹنے کے لیے ہمیں انتہائی تجربہ کار سپاہیوں کی ضرورت پڑے گی۔میں آپ کی بہادری کا اعتراف کرتا ہوں۔لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں ناتجربہ کار رضا کاروں کی ضرورت نہیں۔آپکو اب گھر جانا چاہیےاور مجھے یقین ہے کہ آپ جنگلوں میں ہمارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے وہاں بنگال کے لیے زیادہ کام کر سکتے ہیں

شوکت بیگ نے قدرے برہم ہو کر کہا۔میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میری جان کو اس قدر قیمتی سمجھتے ہیں۔لیکن میں دشمن کے ساتھ لڑنے کی نیت سے آیا ہوں۔پھر ہو میر مدن کی طرف متوجہ ہوا۔میرا خیلا ہے کہ ایک رضا کار کی حیثیت میں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔معظم علی مجھے اپنے ساتھی بنانے سے انکار کر سکتے ہیں۔لیکن مجھے کسی جنگل میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتے۔میں واپس نہیں جاؤں گا۔آخر آپ میری جان ان سپاہیوں

سے زیادہ قیمتی کیوں سمجھتے ہیں جو جنگ میں شہید ہو چکے ہے؟

میر مدن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو میں منع نہیں کرتا۔ معظم علی اسے اپنے ساتھ لے جاو!

معظم علی نے جواب دیا۔ بہت اچھا۔ لیکن میں نے فوجی تربیت آپ سے حاصل کی ہے اور میرے افسر اور سپاہی اکثر شا کی رہتےہیں کہ نظم وضبط کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اس لیے جب تک یہ میری کمان میں ہیں انہیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ انہیں کسی ترجیحی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔

میر مدن نے شوکت بیگ کی طرف دیکھا اور بولا۔ جناب میں جانتا ہوں کہ میں سیر وسیاحت کے لیے نہیں آیا۔

تھوڑی دیر بعد جب محمود علی، یوسف اور افضل کو شوکت بیگ کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔

اگلے روز علی الصبح دو ہزار سوار معظم علی کی قیادت میں کوچ کے لیے تیار کھڑے تھے اور محمود علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ معظم! شوکت بیگ کا خیال رکھنا۔ اگر خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو ہم مرزا حسین بیگ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

○

چند ماہ بعد معظم علی پھر ایک دور افتادہ قلعے میں مقیم تھا۔ اس عرصہ میں دشمن کے ساتھ اس کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں لیکن دور دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں مرہٹے ایک جگہ سے مار کھا کر بھاگتے تو دوسری جگہ کسی دوسری بستی پر حملہ کر دیتے۔ معظم علی اپنی فوج کے باقاعدہ سپاہیوں اور افسروں سے کام لینا جانتا تھا۔ لیکن

شوکت بیگ اوراس کے رضا کار ساتھیوں کی رفاقت اس کے لیے ایک مسئلہ تھی۔وہ انہیں قلعے کی محافظ فوج کے ساتھ رکھنا چاہتے تھا لیکن شوکت بیگ ہر خطرناک مہم میں اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا کرتا تھا۔

ایک روز آدھی رات کے وقت معظم علی کو قلعے سے بیس میل دور دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اوراس نے اس وقت پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیا۔شوکت بیگ نے حسب معمول ساتھ جانے پر اصرار کیا وراس دفعہ وہ انکار نہ کرسکا۔اس مہم میں معظم علی کو یہ احساس ہوا کہ یہ سادہ دل نوجوان حماقت کی حد تک بہادر ہے۔اس لڑائی میں شوکت بیگ یہ ثابت کر چکا تھا کہ گولیوں کی بارش میں بھی وہ سینہ تان کر کھڑا ہوسکتا ہے اور پھر جب دشمن کے سپاہی شکست کھا کر جنگل میں بھاگ رہے تھے تو وہ معظم علی کے احکام کا انتظار کیے بغیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔جن سپاہیوں نے اسے جنگلوں اور پہاڑوں میں گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا وہ شام کے وقت معظم علی سے یہ کہہ رہے تھے۔یہ محض اتفاق ہے کہ یہ نوجوان زندہ واپس آ گیا ہے۔

جب شوکت بیگ کئی میل مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آیا تو اس نے معظم علی سے کہا۔میں نے سات آدمی اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارے ہیں لیکن افسوس کہ میرا گھوڑا تھک گیا تھا۔

معظم علی نے کہا دیکھو شوکت! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تم بہادر ہو لیکن تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو مجھے مجبوراََ تمہیں قلعے میں بند رکھنا پڑے گا۔تمھارے آٹھ آدمی بلاوجہ مارے گئے ہیں

شوکت نے جواب دیا ۔لیکن ان آٹھ آدمیوں میں سے ہر ایک کم از کم دو مرہٹوں کو ساتھ لے کر مرا ہے ۔

معظم علی نے جواب دیا۔اگر وہ آتھ آدمی زندہ رہتے تو یقیناً اس سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے۔

شوکت بیگ نے کہا۔ یہ میری پہلی لڑائی تھی ۔لیکن آئندہ کے لیے میں محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں ۔

معظم علی نے کہا۔اس لڑائی میں تمھاری کارگزاری دیکھنے کے بعد اگر مجھے یہ یقین نہ ہوا ہوتا کہ تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو تو میں آج ہی تمہیں واپس بھیج دیتا۔

اس واقعہ سے چند ماہ بعد معظم علی کو قلعے کے جنوب میں تیس میل دور مرہٹوں کے ایک لشکر کی نقل وحرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اپنی دو تہائی فوج قلعے میں چھوڑ کر باقی سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کی ۔آٹھ دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دوسو قیدی تھے ۔فوج کا ایک افسر اسے قلعے کے دروازے پر ملا اور اسنے مغموم لہجے میں کہا۔ جنابط مرزا شوکت بیگ زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔

معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کی دی۔کہاں ہے وہ۔وہ زخمی کیسے ہوئے؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟

افسر نے جواب دیا۔وہ اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔انہوں نے ہمارا کہانہیں مانا۔کل ہمیں شمال کی طرف چند بستیوں میں مرہٹوں کے لوٹ مار کی اطلاعد ملی تھی۔نائب کماندار نے اسی وقت دوسو سوار روانہ کردیئے ۔مرزا شوکت بیگ اس

مہم میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ہم نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔

تم سب بیوقوف ہو۔

معظم علی یہ کہہ کر بھاگتا ہوا قلعے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔شوکت بیگ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔اس کے سینے،گردن اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فوجی طبیب کے علاوہ چند افسر اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور چند سپاہی کھڑے تھے ۔معظم علی نے کمرے میں داخل ہو کر شوکت بیگ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر طبیب کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔زخم زیادہ شدید تو نہیں؟

طبیب نے جواب دیا۔بہت شدید ہیں۔

معظم علی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے سالاروں کی طرف دیکھا اور کہا ۔میں نے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے اور اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ تم میں سے کسی کی غفلت کا نتیجہ ہے؟

ایک سالار نے جواب دیا۔ہم سب نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔پھر میں احتیاطاً ڈیڑھ سو سپاہی لے کر ان کے پیچھے گیا تھا۔مرہٹے ہمیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ہم نے کوئی پانچ میل ان کا تعاقب کیا اس کے بعد جنگل زیادہ گنجان تھا اور میں نے اپنے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ لیکن یہ مرہٹوں کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔میں مجبوراً ان کے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور چیخ چیخ کر انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری طرف توجہ نہ دی ۔اچانک گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور آن کی آن میں ۃمارے پچیس آدمی گر پڑے،اس کے بعد مرہٹے مقابلہ کرنے کی بجائے

جنگل میں غائب ہو گئے۔ یہ بری طرح زخمی تھے۔ آپ ان کے آدمیوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کاش آپ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت ہوتی کہ اگر یہ زبردستی قلعے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انہیں کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے۔

معظم علی نڈھال سا ہو کر شوکت بیگ کے بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا تم نے بہت بُرا کیا۔ اب میں مرشد آباد واپس جا کر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

شوکت بیگ نے آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے کہا۔ آپ کے ساتھ بے قصور ہیں انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن کا پیچھا کیا تھا۔

معظم علی نے پر اُمید ہو کر طبیب کی طرف دیکھا اور ملتجی لہجے میں کہا۔ آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

طبیب نے جواب دیا۔ آپ اطمینان رکھیئے میرے طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔

شوکت بیگ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

○

شام تک شوکت بیگ پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد معظم علی انتہائی اضطراب اور پریشان کی حالت میں قلعے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ وہ تصور میں کبھی مرزا حسین بیگ اور کبھی فرحت اور اس کی والدہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ تم نے شوکت کو تنہا چھوڑ دیا؟ تم نے اس کی حفاظت کیوں

نہ کی؟ جب ڈھاکہ کی فوج واپس آرہی تھی تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟ وہ ندامت کے ناقابل برداشت بوجھ تلے پسپا جارہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار اس قسم کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ میرے مولی! اگر تیری بارگاہ میں میری کوئی دعا قبول ہو سکتی ہے تو میں تجھ سے شوکت کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے اللہ میں عہد کرتا ہوں کی میں مرتے دم تک فرحت کا خیال اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میں خلوص دل سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے، اس میں تمام وہ خوبیاں ہیں جو فرحت کے رفیقِ حیات میں ہونی چاہیں۔ وہ فرحت کو خوش رکھ سکتا ہے اور فرحت کو خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔

طبیب شوکت کے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر کہا وہ اب ہوش میں ہے اور آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔

معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شوکت بیگ کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اسے شوکت بیگ کا چہرہ بے حد زرد نظر آتا تھا۔ اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ شوکت اب کیا حال ہے؟

شوکت نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ میرے دوست آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کی حکم عدولی کی۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

شوکت بیگ! مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمھارا زندہ رہنا ضروری ہے۔

آپ مجھے ہمیشہ خطرے کے سامنے جانے سے روکنے کی کوشش کیا کرتے تھے

۔ مجھے اس بات سے چڑ ہو گئی تھی ۔ میں بچپن سے بے حد ضدی ہوں ۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا تھا کہ آپ شاید مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔

نہیں شوکت! مجھے صرف اس بات کا ڈر تھا کہ تمھاری جرات میرے لیے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

شوکت نے کہا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ باقی آدمیوں کے مقابلے میں میری جان اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا۔ اگر تم باقاعدہ فوج کے سپاہی ہوتے تو تمھیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی ۔لیکن تم ایک رضا کار کی حیثیت میں آئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ صحیح سلامت اپنے گھر واپس جاؤ۔پھر مجھے یہ معلوم تھا کہ تمھاری شادی ہونے والی ہے اور ایک ایسے خاندان کی لڑکی سے جو مجھے بے حد عزیز ہے ۔اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم تندرست ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤ اور خدا مجھے مرزا حسین بیگ کے سامنے شرمسار نہ کرے۔

شوکت بیگ نے کہا۔ میں شاید گھر واپس نہ جا سکوں ۔لیکن آپ جب مرزا حسین بیگ سے ملیں تو ان سے یہ ضرور کہیں کہ میری موت ایک سپاہی کی موت تھی۔ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سپاہی بننے کا شوق نہ تھا اور یہ شوق صرف تمھاری وجہ سے پیدا ہوا۔ میں بچپن میں ہی اپنے والدین سے سنا کرتا تھا کہ میری منگنی مرشد آباد کے ایک معزز خاندان کی لڑکی کے ساتھ ہو گی ۔اس کے بعد بڑا ہو کر میں نے یہ سنا کہ ایک غریب خاندان کے لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت کی ہے اور شاید وہ اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں پھر تمھاری قید کے زمانے میں مرزا صاحب

ہمارے ہاں آئے تو وہ بات بات پر تمھارا تذکرہ کرتے تھے اور مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس زمانے میں ہر نوجوان کے لیے سپاہی بننا ضروری ہے اور میں تمہیں دیکھے بغیر ہی تمہارے متعلق اپنے دل میں ایک رقابت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔

ایک دن میرے ابا جان نے مرزا حسین بیگ کے سامنے میری تعریف کی تو انہوں نے کہا بنگال میں صرف ایک نوجوان پیدا ہوا تھا اور اس کا نام معظم علی تھا۔ پھر ہماری منگنی ہو گئی اور اس کے چند ہفتے بعد تم واپس آ گئے۔

میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جب ڈھاکہ کی فوج اڑیسہ کی طرف کوچ کی تیاری کر رہی تھی تو میرے ابا جان کو حسین بیگ کا خط ملا، جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ افضل محاذ پر جا رہا ہے۔ مرہٹے ہماری قوم کے ہر نوجوان کو اڑیسہ کے میدانوں میں للکار رہے ہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ جنگ کے اختتام اور افضل بیگ کی واپسی تک شادی ملتوی کر دی جائے۔ انہوں نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے جن دوستوں کا شادی کے موقع پر ہونا ضروری ہے وہ سب محاذ پر جا چکے ہیں۔ میں اس وقت سید حامیر مدن کے پاس پہنچا اور انہیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ میرے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی۔ میں مرزا حسین بیگ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بنگال کے کسی نوجوان سے کم نہیں ہوں۔ میری یہ خواہش تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر میں کسی اور کی بجائے صرف میرے بہادرانہ کارناموں کا ذکر ہو۔ ہر میدان میں تم سے چند قدم آگے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔ میں کوشش کے باوجود ان لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو سکا۔ جنہیں لڑائی کے بعد داد و تحسین کا مستحق سمجھا جاتا

ہے ۔تم ہر میدان میں مجھ سے آگے تھے اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں ۔اس وقت اگر مجھے کسی بات کا افسوس ہے تو وہ یہ کہ میں اپنے ایک بہترین دوست اور ساتھی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا ۔مرزا حسین بیگ درست کہتے تھے کہ بنگال میں صرف ایک نوجوان پیدا کیا اور وہ معظم علی ہے ۔

شوکت بیگ نے کہا۔ معظم علی مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہم ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے لیکن میری منزل اب قریب آچکی ہے ۔اس وقت اگر مرزا حسین بیگ یہاں موجود ہوتے تو میں ان سے یہ کہتا کہ میں نے معظم بننے کی کوشش کی تھی اور میری حماقت تھی ۔

انسان اپنی زندگی میں عجیب وغریب باتیں کرتا ہے ۔ایک دن وہ تھا جب تمھارا نام میرے نزدیک ایک گالی تھا۔ معظم علی بُرا نہ ماننا ۔اب مجھے یہ باتیں کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی ۔ مجھے اس بات پر چڑ تھی کہ تم مرزا حسین بیگ کے پڑوس میں رہتے ہو اور محلے کا ہر آدمی تمہاری تعریفیں کرتا ہے ۔میں نے آج تک فرحت کو نہیں دیکھا لیکن جو کچھ اس کے متعلق میں نے اپنی ماں اور بہنوں سے سنا تھا وہ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ایسی لڑکی کا شریکِ حیات بننا زندگی کی سے بڑی سعادت ہے ۔مجھے یہ بات گوارا نہ تھی، کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جانتی ہو جو مجھ سے بہتر اوصاف کا مالک ہو،فرحت کے رشتے سے مرزا حسین بیگ کا انکار میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی اور میرے لیے اس شکست کا سب سے زیادہ نا قابل برداشت پہلو یہ تھا کہ میرے مقابلے میں ایک غریب خاندان کے لڑکے کو ترجیح دی گئی ہے۔اپنے والدین کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ فرحت کے والدین تمہاری طرف مائل ہیں ۔پھر جب تم لاپتہ ہو گئے تو

میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرے راستے سے ایک پہاڑ ہٹ گیا ہے۔لیکن فرحت کے ساتھ منگنی ہو جانے کے بعد بھی میری خوشی ادھوری تھی۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے معظم علی نہ بن سکوں گا۔پھر ہماری شادی کی تاریخ ملتوی کرنے کے متعلق مرزا صاحب نے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کے کہ مجھے بے حسی، بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیا جارہا ہے جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو میرے عزائم یہ تھے کہ میں کسی دن فتوحات کا پرچم لہراتا ہوا واپس آؤں گا۔اور شہرت،عزت اور ناموری کے سینکڑوں تاج فرحت کے قدموں پر ڈھیر کردوں گا۔تم میری حماقتوں پر ہنسو گے۔

معظم علی نے کہا نہیں شوکت! میں جانتا کہ تمھارے سینے میں ایک نہایت حسین دل ہے۔لیکن کاش اس سے پہلے میں تمہیں بتا سکتا کہ جس فرحت کو جانتا ہوں، وہ ان لڑکیوں سے مختلف ہے جو پانے رفیق حیات کا دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا تم اسے جانتے ہو اور تم اس سے محبت کرتے ہو؟

معظم علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کہا۔شوکت خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔وہ تمھارے لیے ہے اور میں اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔میں تمہیں تندرست ہوتے ہی گھر بھیج دوں گا۔

شوکت بیگ نے کہا۔میرے دوست ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا۔میں نے یہ باتیں تمھارا دل دُکھانے کے لیے نہیں کیں،صرف اس لیے کی ہیں کہ میرے دل پر ایک بوجھ تھا کہ میں ایک ایسے آدمی کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور رقابت کے جذبات رکھتا تھا جس کے

ساتھ مجھے محبت کرنی چاہیے تھی۔ معظم علی! تم انسان نہیں ایک فرشتہ ہو۔ کاش اس وقت افضل کی بہن یہاں موجود ہوتی اور اسے میں یہ کہہ سکتا کہ تمھارا مستقبل ایک بہتر انسان کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ شوکت بیگ نے یہ کہہ کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ معظم علی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے اور شوکت بیگ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پر شوکت کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ معظم علی نے طبیب کو آواز دی طبیب نے آ کر شوکت بیگ کی نبض دیکھی اور اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ ان کا وقت آ چکا ہے۔

اس کے بعد وہ دیر تک جانکنی کی حالت میں پڑا رہا اور رات کے پچھلے پہر جب قلعے سے باہر درخت پر کوئل کی آواز صبح کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ شوکت بیگ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

○

طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد شوکت بیگ کو سپرد خاک کیا جا چکا تھا اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ معظم علی نے شوکت بیگ کے والد اور مرزا حسین بیگ کے نام خطوط لکھ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

اگلے دن معظم علی، علی الصباح ایک ہزار سوار لے کر مرہٹوں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور چند مہینے سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں ان کا پیچھا کرتا رہا۔ جب وہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو قیدی تھے۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ سال وہ سرحد کے اہم مقامات پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے اور مرہٹوں کے

ستائے ہوئے لوگوں کی ویران بستیوں کو دوبارہ آباد کرنے میں مصروف رہا۔پھر اس نے میر مدن کے نام درخواست لکھ کر ایک ماہ کی رخصت لی اور مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

مرشد آباد پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ علی وردی خاں بستر مرگ پر ہے اور سراج الدولہ نے میر مدن اور سلطنت کے چند اور بڑے عہدیداروں کو مرشد آباد بلا لیا ہے ۔مرزا حسین بیگ کے متعلق اسے یہ اطلاع ملی کی ہو چند ہفتے قبل ایک جہاز پر حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی نیت سے روانہ ہو چکے ہیں

معظم علی نے گھر میں اپنی چھٹی کے پانچ دن گزارے تھے کہ علی وردی خاں رائی ملک عدم ہوا اور مرشد آباد کے باشندے یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنگال کا وہ دفاعی حصار ٹوٹ چکا ہے جسے وہ اپنی آزادی اور بقا کی سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے ۔مرشد آباد کی مساجد میں علی وردی خاں کے لیے مغفرت اور بنگال کے نئے حکمران سراج لدولہ کے لیے کامیابی اور کامرانی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

علی وردی خاں کی وفات کے تین دن بعد معظم علی نے میر مدن سے جسے ڈھاکہ سے بلا کر بنگال کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی تھی، ملاقات کی اور اسے بعد گھر واپس آ کر اپنی ماں سے کہا۔امی جان! میری رخصت منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

ماں نے مغموم لہجے میں کہا۔میرا خیال تھا کہ سراج الدولہ اور میر مدن تمہیں مرشد آباد میں کوئی عہدہ دے دیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا۔امی جان میرا وہاں جانا ضروری ہے۔میں نے میر مدن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائی یوسف کو ڈھاکہ سے یہاں بلا لیں اور انہوں

نے میری یہ بات مان لی ہے۔

ماں نے کہا۔بیٹا! میں ایک عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر جا کر تمہارے رشتے کے متعلق کچھ کہوں ۔ابھی فرحت کی ماں مجھ سے مل کر گئی ہے۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مرزا صاحب فرحت کے رشتے کے متعلق ہماری طرف سے سلسلہ جُنبانی کی منتظر تھے۔میں نے کہا ۔بہن میں تو ہر روز معظم کے ابا کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا کرتی تھی،لیکن انہیں حوصلہ نہیں ہوا۔اب اگر آپ تیار ہیں تو میں ابھی محلے میں مٹھائی تقسیم کرواتی ہوں۔لیکن انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں حج سے مرزا صاحب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔

معظم علی نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے کہا۔امی جان فرحت کیسی ہے؟

ماں نے جواب دیا۔فرحت چند ہفتوں سے کچھ بیمار تھی۔لیکن اب بالکل ٹھیک ہے۔

چند دن بعد معظم علی سرحدی قلعے میں پہنچ چکا تھا۔

○

علی وردی خاں کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ حریص قسمت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مال تجارت سمجھتے تھے۔انگریزوں کے کے ساتھ ساز باز کرنے لگے۔سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔اور اس نے مسندِ حکومت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف توجہ کی۔انگریز تاجر،حکومتِ بنگال کے

ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قلعہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے کئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن فورٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔

معظم علی چند ماہ سے مغربی سرحد پر اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے انگریزوں کے متعلق سراج الدولہ کے عزائم کا علم ہوا تو اس نے میر مدن کو ایک خط لکھا کہ اب سرحدی علاقوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔

چند ہفتوں تک اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا اور وہ سخت بے چین رہا۔ پھر ایک دن اسے میدنا پور کے فوجدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کی چار دن بعد اسے میر مدن کا خط ملا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ہم انگریزوں کو ایک عبرتناک شکست دے چکے ہیں۔ لیکن تمہیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اس کامیابی میں تمھارا کوئی حصہ نہیں۔ انگریزوں کے خلاف ہم نے ایک لڑائی جیتی ہے لیکن بنگال کو ان کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے ہمیں شاید ایسی کئی اور جنگیں لڑنی پڑیں اور ان جنگوں سے ہم اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سرحدی علاقے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہوں۔ تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور تم نے ہر مرحلے پر اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ جب تک انگریزوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوتی تم بنگال کے مغربی دروازے پر پہرہ دیتے

رہو اور میں تم جیسے سمجھدار نوجوان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑنے والے سپاہی کی نسب خاموشی سے پہرہ دینے والے سپاہی کا کام بسا اوقات زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔

چند مہینے اور گزر گئے اور معظم علی کو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ سراج الدولہ انگریزوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کررہا ہے۔ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مرزا حسین بیگ حج سے واپس آگئے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ تم چند دن کے لئے گھر آؤ۔اس نے میدنا پور کے فوجدار کو ایک ماہ کی رخصت کیلئے درخواست بھیجی، لیکن اس نے جواب میں لکھا، موجودہ حالات میں تمہیں ایک دن کیلئے بھی چھٹی دینا ممکن نہیں۔نواب سراج الدولہ نے مجھ سے پانچ ہزار سوار دو ہفتوں کے اندر اندر مرشد آباد بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے۔انہوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی تاہم سپہ سالار کے خط سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ عنقریب انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کچھ مدت اور انتظار کرو ۔اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کی چھٹی دے دوں گا۔فی الحال پانچ ہزار سواروں کی تعداد پوری کرنے کیلئے تمھارے آدمیوں کی ضرورت ہے۔اس لیے میرا خط ملتے ہی اپنے تمام فالتو سپاہی سیدھے مرشد آباد روانہ کردو اور اپنے پاس صرف اتنے آدمی رکھو جو قلعے اور سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اشد ضروری ہوں۔

معظم علی نے یہ خط ملتے ہی پانچ سو سپاہی قلعے کی حفاظت اور تین سو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی چوکیوں کی نگرانی کے لیے روک لیے اور باقی فوج کو اپنے ایک تجربہ کار افسر کی کمان میں دے کر مرشد آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

○

چند ہفتے معظم علی کو مرشد آباد کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی اور وہ سخت بے چین رہا۔ایک دن اسے محمود علی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے سراج الدولہ نے اپنے محافظ دستوں کا سالار اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔یوسف اور افضل بھی محافظ فوج کے سالار بنا دیئے گئے ہیں۔ہمیں آٹھ پہر کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم ملا ہے اور انشاء اللہ عنقریب تم یہ سنو گے کہ ہم بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہمیشہ سے نجات دلا چکے ہیں۔

اس کے بعد چند دن اور گزر گئے اور معظم علی کو جنگ کے حالات کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی

ایک روز رات کے تیسرے پہر معظم علی قلعے کے اندر اپنی قیام گاہ کی چھت پر گہری نیند سو رہا تھا۔ایک پہریدار نے سے جگایا اور یہ اطلاع دی کہ مرہٹوں نے سرحد کی ایک چوکی پر اچانک حملہ کر کے تیس سپاہی موت کی گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ معظم علی جلدی سے نیچے اترا۔چند سپاہی جو سرحد کی چوکی سے بھاگ کر آئے تھے قلعے کے صحن میں کھڑے تھے۔معظم علی ان سے حملے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایک پہریدار بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ دروازے کے باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہماری چوکی پر بھی مرہٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

معظم علی نے تین سو سواروں کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر پہریدار کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔اگر تم اسے پہچانتے ہو تو اسے اندر آنے دو۔

جی میں اسے پہچانتا ہوں۔پہریدار یہ کہہ کر اس طرح بھاگتا ہوا واپس چلا گیا

اور تھوڑی دیر بعد ایک آدمی لنگڑاتا ہوا قلعے کے صحن میں داخل ہوا۔

معظم علی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ تم زخمی ہو؟

جی میں قلعے سے ایک میل دور گھوڑے سے گر پڑا تھا۔

تم کس چوکی سے آئے ہو؟ معظم علی نے سوال کیا۔

جی میں شمال کی تیسری چوکی سے آیا ہوں مرہٹوں نے ہم پر بے خبری کی حالت میں حملہ کر کے ہمارے بیشتر آدمی قتل کر دیئے۔ میرے باقی ساتھ اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

معظم علی نے ایک عمر رسیدہ افسر کی طرف متوجہ ہر کر کہا۔ عبدالرحمٰن! معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے بڑے پیانے پر پیشقدمی شرع کر دی ہے۔ مجھے شاید اس امہم میں چند دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں قلعے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہوگی۔ تم اسی وقت تمام چوکیوں کے سپاہیوں کو یہ حکم بھیج دو کہ وہ قلعے میں جمع ہو جائیں۔ اگر مرہٹوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔ ہمیں باہر سے کیس فوری کمک کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر مرہٹے آگے بڑھ آئے تو یہ قلعہ ہمارا آخری سہارا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی تین سو سواروں کے ہمراہ قلعے سے باہر نکل گیا۔

سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے والے مرہٹوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سرحدی علاقے کی محافظ فوج کی دفاعی طاقت کا اندازہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ علی الصباح قلعے سے چند میل دور مرہٹوں کے چند دوستوں کے ساتھ معظم علی کے سپاہیوں کی جھڑپ ہوئی اور وہ معمولی مقابلہ کے بعد پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد اسے چند

میل دور مرہٹوں کے ایک اور دستے کی اطلاع ملی اور اس نے چاروں طرف سے گھیر اڈال کر انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

مرہٹوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر سرحد کے لوگ اپنی بستیاں خالی کر رہے تھے لیکن معظم علی کی طرفف سے بروقت جوابی کاروائی کے باعث ان کے حوصلے بندھ گئے اور وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ایک شام کوئی پچاس مرہٹے ایک بستی کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ معظم علی خبر ملتے ہی وہاں پہنچا اور اس نے تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے پہنچنے سے پیشتر مرہٹے بستی کے چودھری کے پانچ بیٹوں کے علاوہ دس اور آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ مرہٹوں کے ہاتھوں چند لڑکیوں کی بے حرمتی خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔

معظم علی نے رات بھر اس بستی میں قیام کیا۔ صبح ہوئی تو اس نے آس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے سامنے بھیڑوں کی طرح بھاگنے والوں کو بچانا کسی فوج کا کام نہیں۔ فوج کی مدد صرف ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے جو بہادروں کی طرح جینا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ان چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کیلئے اپنی بستیوں میں رضا کاروں کی فوج تیار کرو۔ پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تم جیسے خونخوار درندوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ میں تمھیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔ جن کے جواب بیٹوں اور بھائیوں کی روحیں انتقام کے لیے پکار رہی ہیں اور میں ان سے یہ کہوں گا کہ وہ تمہیں کسی انسانی سلوک کا مستحق نہ سمجھیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمھارے دوسرے ساتھی اس طرف آئیں تو

انہیں اس بستی کا باہر ہر درخت کے ساتھ تمہاری لاشیں نظر آئیں۔

ایک گھنٹہ بعد جب معظم علی اس بستی سے رخصت ہوا تو مقامی لوگ گاؤں سے باہر تیس مرہٹوں کے گلوں میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکا چکے تھے۔

چند دن تک مختلف مقامات پر درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس بات کا ثبوت دیتی رہیں کہ سرحد کا محافظ ان علاقوں سے گزرا ہے۔

قریباً بیس دن کے اندر سرحدی علاقوں میں مکمل امن قائم کرنے کے بعد معظم علی واپس پہنچا اور اس نے قلعے میں داخل ہوتے ہی اپنے قائم مقام سے سوال کیا۔ مرشد آباد یا میدنا پور سے کوئی اطلاع آئی ہے؟

جی نہیں! قائم مقام نے جواب دیا۔

دو دن بعد میدنا پاور سے ایک فوجی افسر جس کا نام ہاشم خاں تھا تیس سواروں کے ہمراہ معظم علی کے پاس پہنچا اور اس نے میدنا پور کا فوجدار کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

تم خط ملتے ہی قلعے کی کمان ہاشم خاں کے حوالے کر کے میدنا پور پہنچ جاؤ۔ میں چند اہم معاملات کے متعلق تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔

معظم علی نے خط پڑھنے کے بعد ہاشم خاں سے سوال کیا۔ مرشد آباد سے جنگ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہے؟

ہاشم خاں نے جواب دیا۔ جنگ کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن مرشد آباد سے ایک خاص ایلچی میدنا پور کے فوجدار کے پاس آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے لیکن اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد فوجدار نے مجھے اس طرف

روانہ کر دیا اور میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ ایلچی کیا خبر لایا تھا۔فوجدار نے اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ آپ فوراً میدنا پور پہنچ جائیں!

معظم علی نے کہا۔اگر وہ تاکید نہ کرتے تو بھی میری طرف سے تاخیر نہ ہوتی۔ میں وہاں پہنچ کر مرشد آباد کے حالات معلوم کرنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔

قریباً آدھ گھنٹہ بعد معظم علی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔چار نوجوان اس کے ساتھ تھے۔وہ قلعے سے صرف چار کوس دور گیا تھا کہ اسے ایک سرپٹ سوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔جب ان کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو معظم علی کے ایک ساتھی نے کہا۔جناب وہ عبداللہ خاں معلوم ہوتا ہے۔

معظم علی نے تھوڑی دور آگے جا کر گھوڑا روکا اور آنے والے سوار کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔عبداللہ خاں نے قریب آ کر کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔آپ کہاں جا رہے ہیں؟

میں میدنا پور جا رہا ہوں۔معظم علی نے جواب دیا۔تم گھر کے حالات سناؤ۔

عبداللہ خاں، معظم علی کی فوج کے پچاس سواروں کا سالار تھا۔مرشد آباد میں اس کا گھر بھی معظم علی کے پڑوس میں تھا۔قریباً تین ماہ سے رخصت پر تھا۔وہ جواب دینے کی بجائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گردن جھکا کر معظم علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

کیا بات ہے عبداللہ؟معظم علی نے سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔میں بہت بُری خبر لایا ہوں آپ میدنا پور کی بجائے سیدھے گھر جائیں۔مرشد آباد لٹ چکا ہے!

معظم علی گھوڑے سے کود پڑا اور عبداللہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے

ہوئے چلایا۔خدا کے لیے مجھے جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے؟

عبداللہ خاں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کرتے ہوئے کہا۔آپکے ابا جان اور یوسف شہید ہو چکے ہیں۔افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام واقعات کی اطلاع مل چکی ہوگی۔ہم جنگ ہار چکے ہیں۔میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

معظم علی دیر تک بے حس وحرکت کھڑا رہا۔وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی موت کا یقین کر سکتا تھا۔لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لیے نا قابل یقین تھی۔اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا۔سراج الدولہ کہاں ہیں؟ ہمیں شکست کیسے ہوئی؟

سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد آ گئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔

یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔

ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ہم اپنے غداروں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر چکا ہے۔میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔میر جعفر نے فوج کے افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔میں جنگ میں شریک تھا اور غداری اور وطن فروشی کا منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ہمارا توپخانہ خاموش تھا۔ہمارے بیشتر سوار میدان سے دور کھڑے تھے۔سراج الدولہ کے مٹھی بھر جاں نثار سینوں پر گولیاں کھا کر گر رہے تھے اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ

ہماری توپیں اچانک آگ برسائیں گی ۔ ہمارے سوار اچانک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور آن کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا لیکن یہ معلوم ہوا تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں ۔میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یوسف اور افضل کو گر کر دم توڑتے دیکھا تھا اور آپ کے ابا جان جب زخموں سے چُور ہو کر مرشد آبد پہنچے تھے تو میں ان کے ساتھ تھا۔سراج الدولہ انہیں محل میں اپنے ساتھ لے گئے تھے ۔پھر رات کے وقت جب وہ مرشد آباد چھوڑ رہے تھے تو آپ کے ابا جان کو گھر پہنچا دیا گیا تھا۔آدھی رات کے وقت انہوں نے دم توڑ دیا تو محلے کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو اطلاع دوں ۔

معظم علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔اب ہمیں میدنا پور جانے کی ضرورت نہیں ۔تم واپس قلعے میں چلے جاؤ۔میری منزل مرشد آباد ہے۔عبداللہ تمھارا کیا ارادہ ہے؟

میں آپ کے ساتھ ہون ۔اس نے جواب دیا۔

مرشد آباد کی طرف چند منازل طے کرنے کے بعد معظم علی نے یہ خبر سنی کہ سراج الدولہ قتل ہو چکا ہے ۔میر جعفر نے لارڈ کلایو کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے اور مرشد آباد میں سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔

نواں باب

ایک رات جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ معظم علی اور عبداللہ خاں اپنے محلے کے سنسان گلی میں داخل ہوئے۔ عبداللہ خاں کا گھر پہلے آتا تھا۔ معظم علی نے اس کے مکان کے دروازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔ عبداللہ اب تم اپنے گھر جا کر آرام کرو اور میرا گھوڑا بھی لے جاؤ۔

عبداللہ خان نے معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ اپنے مکان کی طرف چل دیا۔

تاریک اور سنسان گلی میں اِدھر اُدھر کے بعد معظم علی نے اپنے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے صابر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

صحن کی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ وہ چند ثانیے توقف کے بعد دیوار پر چڑھا اور صحن میں کود پڑا۔ مردانہ حصے کا صحن تاریک تھا اور گلی کی طرح یہاں بھی ایک بالشت پانی جمع ہو چکا تھا۔ معظم علی سامنے کی دیوار کے ایک کھلے دروازے سے گزرنے کے بعد رہائشی مکان کے صحن میں داخل ہوا۔ اسے نچلی منزل میں کونے کا ایک کمرہ روشن نظر آیا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھلی تھے روشن کمرے کی طرف قدم اٹھاتے وقت معظم علی کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ یہ وہ گھر تھا جہاں ہر وقت مسرت کے قہقہے اس کا استقبال کیا کرتے تھے۔ بجلی چمکی اور اسے بالائی منزل قبرستان سے زیادہ اُداس اور سنسان دکھائی دی۔ اس نے نوکر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور برآمدے سے گزرنے کے بعد کونے کمرے میں داخل ہوا چند ثانیے وہ بے حس و حرکت کمرے

کے درمیان کھڑا رہا۔اس کی ماں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی ۔ چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا رنگ بیحد زرد معلوم ہوتا تھا۔وہ عورت جس کی صحت پر پڑوس کی نوجوان لڑکیاں رشک کرتی تھیں ۔اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی ۔ایک سن رسیدہ عورت اس کے بستر کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی وہ معظم علی کو دیکھتے ہوئی کرسی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

معظم بیٹا! تمھارا گھر لٹ چکا ہے۔اس کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں ۔آمنہ نے آنکھیں کھولیں معظم علی۔امی جان! امی جان! کہتا ہوا آگے بڑھا ماں نے ہاتھ پھیلا دیئے اور اس نے بستر کے قریب دوزانو ہو کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔آمنہ معظم علی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے چیخیں ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔اس نے کہا میرے بیٹے! میرے لال تم اس طوفان میں آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے ۔میں صرف تمھارا انتظار کر رہی تھی ۔تمھارے ابا جان کو بھی تمہارا انتظار تھا لیکن تم نہ آسکے اور یوسف ہم میں سے کسی کا بھی انتظار نہ کر سکا۔

معظم نے چند سسکیاں لیں اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگالیا۔معظم علی نے گردن اٹھائی اور اپنا دوسرا ہاتھ ماں کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔

امی جان آپ کو بخار ہے۔میں طبیب کو بلاتا ہوں ۔صابر کہاں ہے؟

ماں نے کاہ۔صابر ابھی اٹھ کر گیا ہے۔وہ کئی راتوں سے نہیں سویا اور طبیب کو بلانے کی ضرورت نہیں ۔حکیم احمد خان ہر روز یہاں آتے ہیں۔آج شام کے وقت بھی مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔معظم علی میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یہاں نہیں رہو گے ۔وہ

پرسوں ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تھے، تمھارے ابا اور یوسف کی بندوقیں اور تلواریں لے گئے ہیں۔ پڑوسی اب ہماری ءگھر کے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اگر ہو حمیدہ کو یہاں نہ بھیجتیں تو میں شاید اب تک تمہارا انتظار نہ کرسکتی۔ صابر کے سوا ہمارے سب نوکر خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ میرے طرح حسین بیگ بھی بستر پر پڑا ہوا ہے۔ لیکن فرحت صبح شام مجھے دیکھنے کیلئے آتی رہتی ہے۔ بیٹا! ہماری طرح ان کا گھر بھی اجڑ چکا ہے۔

امی جان میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ عبداللہ خاں مجھے راستے میں ملا تھا۔

ماں نے کہا۔ یوسف اور افضل پلاسی کے میدان میں دفن ہیں۔ کاش میں موت سے پہلے وہاں جاسکتی۔ حسین بیگ وہاں جانا چاہتا تھا لیکن اسے حکم ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں جاسکتے۔ میر جعفر نے اس کی جاگیر بھی ضبط کرلی ہے وہ یہاں سے ہجرت کا ارادہ کررہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ۔

امی جان جب آپ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھہریں گے۔

ماں نے عمر رسیدہ عورت کو دیکھا اور کہا۔ حمیدہ تم نے بھی دو رراتوں سے آرام نہیں کیا۔ جاؤ ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ!

حمیدہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑی لیکن باہر جھا نکنے کے بعد مڑ کر بولی بارش تھم چکی ہے۔ میں گھر جاتی ہوں۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلالیں۔

حمیدہ کرنے سے نکل گئی اور معظم کی ماں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ بیٹا اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

معظم کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ماں کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ امی جان آپ کا بخار بہت تیز ہے۔ میں حکیم کو بلاتا ہوں۔

نہیں۔نہیں۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔تم میرے سامنے بیٹھے رہو! تو میں صابر کو بھیجتا ہوں۔

حکیم دوا دے کر گیا ہے بیٹا! اب وہ کیا کرے گا۔تم میری بات تو سن لو۔ اصطبل میں کھرلی کے دائیں سرے پر آخری کھونٹے کے بالکل ساتھ تمہاری امانت دفن ہے۔وہ نکال لینا۔وہ تمہارے کام آنے والی چیز ہے۔میں آج صابر کو بتانے کا ارادہ کر رہی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔ جب وہ تلاشی لینے آئے تھے تو میں ڈرتی تھی لیکن تمہارے ابا جان کا خیال صحیح تھا۔اگر میں اسے مکان کے اندر چھپانے کی کوشش کرتی تو وہ ضرور تلاش کر لیتے۔انہوں نے ایک ایک کونے کی تلاشی لی تھی۔شاید انہیں شک تھا کہ سراج الدولہ تمھارے ابا کو کوئی چیز دے گیا ہے۔ظالم تمہاری کتابیں تک لے گئے ہیں۔مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن حکیم احمد خاں نے کہا یہ مر رہی ہے اسے تنگ نہ کرو۔میر جعفر کا بیٹا میرن ان کے ساتھ تھا۔وہ حسین بیگ کے گھر بھی گئے تھے۔وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔فرحت کی ماں نے میرن کو بُرا بھلا کہا اور اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔فرحت آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔

معظم علی غصے کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔اس کی آنکھیں آگ کے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

ماں نے کہا۔ بیٹا اب اس ملک میں عزت اور شرافت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مرشد آباد پر خدا کا قہر نازل ہو چکا ہے۔حسین بیگ کو علی وردی خاں کے وزیر سلام

کرتے تھے۔افضل اور آصف، سراج الدولہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آج میر جعفر جیسے ذلیل انسان کے ہاتھوں ان کی ماں اور بہن کی عزت محفوظ نہیں۔

معظم علی کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کرب انگیز آواز نکلی امی جان میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔میں اُن سے تمام مظالم کا بدلہ لوں گا۔

نہیں معظم! تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔تمہارے باپ کو مرتے وقت یہی خوف تھا کہ تم جوش میں آکر اپنی جان پر کھیل جاؤ گے۔اور پھر دنیا میں ہمارا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔میرے بعد یہاں سے کہیں دور چلے جانا اور وہ امانت ضرور نکال لینا۔تمھارے کام آئے گی اور شاید تم اس سے حسین بیگ کی مدد بھی کر سکو، وہ ہیرے بہت قیمتی ہیں اور میں نے اپنے زیور اور چند اشرفیاں بھی ان کے ساتھ دفن کر دی ہیں لیکن کسی کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

معظم علی نے پوچھا۔وہ ہیرے کہاں سے آئے؟

بیٹا تمہارے ابا جان زخمی ہو کر سراج الدولہ کے ساتھ مرشد آباد پہنچے تھے۔محل کے ایک پہریدار نے مجھے اطلاع دی۔میں وہاں پہنچی ان کی حالت بہت خراب تھی۔سراج الدولہ اور شاہی طبیب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ زخم بہت خطرناک ہیں اور اس حالت میں سفر کی وجہ سے ان کا بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔۔سراج الدولہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہتا تھا کہ میں انہیں منع کیا تھا لیکن یہ کسی حالت میں بھی میرا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔وہ یوسف کی لاش کو بھی سپرد خاک ہوتا نہ دیکھ سکے۔میں شام تک وہیں رہی لیکن ان کی حالت خراب ہوتی گئی۔رات کے وقت جب سراج الدولہ نے مرشد آباد چھوڑنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے پہریداروں کو حکم دیا کہ انہیں گھر پہنچا دیا جائے اور

جب وہ ان کی چارپائی اٹھانے لگے تو سراج الدولہ نے اپنا ہار اتار کر میرے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ میری بہن یہ انعام نہیں خراج ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے تمام خزانے بھی محمود علی خاں کی وفاداری کا صلہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں نے اس کا تحفہ قبول نہ کیا۔ جب ہم محل سے نکلے تو خواجہ سرا ہمارے ساتھ تھا۔ سپاہی تمہارے ابا جان کو گھر چھوڑ کر چلے گئے لیکن خواجہ سرا رہ گیا اور اس نے مجھے ایک چھوٹی سے تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا۔ یہ نواب صاحب نے بھیجی ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ تھیلی میرے سامنے رکھ کر چلا گے۔

تمھارے ابا جان راستے میں بیہوش ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں ہوش آیا تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں وہ تھیلی جس میں بیش قیمت ہیرے تھے اپنے پاس رکھنے کی بجائے اصطبل میں دفن کر دوں۔ اس وقت میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے وہ تھیلی تمہاری کتابوں کی الماری میں رکھ دی۔ آدھی رات کے قریب وہ چل بسے۔ آخری وقت وہ مجھے بار بار تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً ہجرت کر جائیں انہیں ڈر تھا کہ تم یہاں رہ کر کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ صبح کے وقت حکیم احمد خاں، مرزا حسین بیگ اور پڑوس کے چند غریب لوگوں کے سوا ان کے جنازے میں کوئی نہ تھا۔ حسین بیگ کی طبعیت خراب تھی، حکیم احمد خان نے انہیں روکا لیکن وہ جنازے میں شامل ہونے پر بضد تھے۔ اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے۔ اور میں نے تمھارے لیے ان ہیروں کی حفاظت کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ رات کے وقت میں نے انہیں دفن کر دیا۔ ان کے ساتھ میرے زیورات بھی دفن ہیں۔ آج شام میں سوچ رہتی تھی کہ اگر تم نہ آئے تو میں صابر کو بتا دوں گی لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ میرے دل سے ایک بوجھ اتر چکا

ہے۔ جب تم کھرلی کے بائیں سرے پر آخری کھونٹے کے ساتھ زمین کھودو گے تو تمہیں ایک صندوقچی ملے گی۔ صندوقچی کے اندر ایک چمڑے کی تھیلی ہے جس میں وہ ہیرے اور میرے زیورات ہیں۔

معظم خاموش تھا۔ اسے جواہرات اور اشرفیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تصور میں کبھی اپنے بھائی کو میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرتا اور کبھی اپنے بات کو نزع کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ افضل کے متعلق سوچتا اور زندگی کی ہر شے اسے بے حقیقت اور بے معنی نظر آنے لگتی۔

ماں نے کہا۔ بیٹا تمہاری غیر حاضری میں فرحت تمہارے متعلق پوچھا کرتی تھی وہ کتنی شوخ تھی لیکن اب اس کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ حسین بیگ کی بیماری کے باوجود ہر روز میرے پاس آتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے بھی میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اس نے حمیدہ کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔ میں سمجھا کرتی تھی کہ وہ مغرور ہے لیکن انہوں نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ کاش تم اس احسان کا بدلہ دے سکو۔ بیٹا مجھے اپنے باپ کے پاس دفن کرنا۔

معظم علی نے کہا۔ امی جان آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔

ماں مسکرائی، لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے آنسوؤں اور آہوں سے زیادہ کرب انگیز تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ بیٹا یوسف جیسے بیٹے کی موت کے بعد کوئی اور تمہارے ابا جیسے شوہر کی موت کے بعد کوئی بیوی زندہ نہیں رہ سکتی۔ بیٹا سچ کہو، تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟ تم تو یہاں سے بہت دور تھے۔ میر جعفر کو تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔

معظم علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ امی جان مجھے کوئی خطرہ نہیں۔

ماں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ بیٹا میں خدا سے دعا کرتی تھی کہ موت سے پہلے صرف ایک لمحہ کے لیے تمہیں دیکھ لوں۔ پھر میں خوشی سے جان دے دوں گی۔ لیکن اب تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ کم از کم اس وقت جب تک مجھے یہ یقین نہیں ہو جاتا ہے کہ تمہیں ان درندوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ بیٹا اگر تمہیں کوئی خطرہ ہے تو خدا کے لیے یہاں نہ ٹھہرو!

معظم علی نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ امی جان میرے رگوں میں میرے غیور باپ کا خون ہے۔ اگر مرشد آباد بھیڑیوں سے بھر جائے تو بھی میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

ماں نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرے اللہ میرے بیٹے کو دشمن سے بچانا۔ اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں۔ آہستہ آہستہ معظم کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔

امی جان! امی جان! معظم علی نے گھبرا کر کہا۔

ماں نے آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر معظم علی کیطرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

امی جان! معظم علی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

ماں کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ پھر اس نے ایک کپکپی کے بعد دو تین گہرے سانس لیے اور اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو تکیے پر گر پڑے۔

امی! امی! معظم علی اسے بازؤ سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکی تھی۔

معظم علی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ اسے یہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مرچکی ہے۔آمنہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ابھی تک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔یہ نہیں ہوسکتا۔یہ ایک خواب ہے۔امی! امی! وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی نبضیں ٹٹول رہا تھا۔اسے گہری نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کررہا تھا۔تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کردیں۔

○

پچھلے پہر چراغ ٹمٹا رہا تھا لیکن اس نے اٹھ کر تیل ڈالنے یا نوکر کو آواز دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔اس کے دل میں کسی کو دیکھنے یا کسی کے ساتھ بات کرنے کی خواہش نہ تھی۔ماضی اور حال کے واقعات کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھیں۔

وہ نیم خوابی کی حالت میں اپنے والدین، اپنے بھائی اور اپنے دوستوں کو دیکھ رہا تھا۔کبھی وہ مکتب کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا اور کبھی فوج کے جوانوں کے ساتھ فنون سپہ گری کی مشق کررہا تھا۔پھر جب وہ ماضی کے سپنوں کی دنیا سے نکل کر حال کی تلخیوں کا سامنا کرتا تو اس کا دل نفرت اور حقارت سے بھر جاتا۔صبح کے آثار نمودار ہورہے تھے اور وہ نیم خوابی کی حالت میں آنکھیں بند کیے کبھی دلکش اور کبھی بھیانک سپنے دیکھ رہا تھا۔اچانک اسے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے کانوں نے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آنے لگی تاہم وہ بدستور آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ہاتھ کی انگلیاں اس کی پیشانی کو چھونے لگیں۔پھر

کسی نے نحیف اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ معظم! معظم!

معظم نے مڑ کر دیکھا اور اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

کون فرحت؟

فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا دیا۔

معظم علی نے کہا۔ امی جان اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔

فرحت نے اپنی اوڑھنی کے ساتھ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم ہے۔ میں انہیں دیکھ چکی ہوں۔ میں کافی دیر سے یہاں کھڑی تھی۔ آپ شاید سو رہے تھے۔ میں ڈر گئی تھی۔ آپ کی طبعیت ٹھیک ہے نا؟

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور اسے اس ظلم، مکر اور ریا کی تاریک دنیا میں ایک روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ فرحت میں بہت سخت جان ہوں۔

فرحت نے کہا۔ حمیدہ کہاں گئی؟ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ اگر ان کی طبعیت زیادہ خراب ہو تو ہمیں اطلاع دینا۔ میں نے صابر سے بھی کہتا تھا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ وہ رات کے وقت اپنے گھر چلی گئی تھی اسے امی جان نے بھیجا تھا۔

آپ کب آئے تھے؟

میں آدھی رات کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت امی جان کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی وہ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہیں لیکن پھر اچانک مجھے

اب بھی ان کی موت کا یقین نہیں آتا لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔چند دنوں کے اندر اندر کتنی ناقابل یقین باتیں ہو چکی ہے۔ یوسف اور افضل کی موت پر کسے یقین آسکتا ہے۔فرحت کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ افضل اور یوسف مجھے کتنے عزیز تھے اوران کی موت کے میرے لیے کیا معنی ہیں؟

مجھے معلوم ہے۔

تمہارے ابا جان اب کیسے ہیں؟

شام کے وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن آدھی رات کے قریب انہیں نیند آ گئی تھی اوراب ان کی حالت کچھ بہتر ہے۔نماز کے وقت مجھے امی جان نے کہا تھا کہ میں چچی جان کا پتہ کروں۔اب میں جاتی ہوں۔وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔

معظم علی نے کہا۔فرحت امی جان تمہاری بہت احسان مند تھیں اور میں بھی ہمیشہ تمہارممنون رہوں گا۔

لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا ملال رہے گا کہ میں آخری وقت ان کے پاس نہ تھی۔ یہ کہہ کر فرحت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن دہلیز سے باہر پاؤں رکھتے ہوئے وہ رکی اورمڑکر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئی بولی۔ ابا جان کہتے تھے کہ آپ کا یہاں آنا خطرناک ہے۔وہ ہراچھے آدمی کو گرفتار کر رہے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔آپ فکر نہ کریں۔اب میرے لیے کوئی بات خطرناک نہیں ہوسکتی۔

لیکن آپ کو احتیاط ضرور کرنی چاہیے!

مجھے یقین ہے کہ افضل کی بہن مجھے خطرے سے بھاگنے کا مشورہ نہیں دے گی

۔

نہیں، میں آپ کو بھڑیوں کا مقابلہ کرنے سے منع نہیں کرتی۔صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ان کے نرغے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔

اب سارا بنگال بھیڑیوں کے نرغے میں آچکا ہے۔

فرحت کچھ اور کہے بغیر باہر نکل گئی۔

ایک ستارہ جسے اس نے ہمیشہ آسمان کی بلندیوں پر دیکھا تھا اس کی ظلمت کدہ میں نور کی کرنیں بکھیرنے کے بعد روپوش ہو چکا تھا۔معظم علی کچھ دیر دروازے میں کھڑا صحن کی طرف دیکھتا رہا۔فرحت، مرزا حسین بیگ کی بیٹی، آصف اور افضل کی بہن اس کے گھر آئی تھی۔وہ اسے دیکھ چکا تھا۔اس کیساتھ باتیں کر چکا تھا۔لیکن ساز حیات کے وہ تار جو کبھی اس کے تصور سے لرز اٹھتے تھے۔اب خاموش تھے۔آرزوؤں، امنگوں اور ولولوں کا وہ صنم کدہ جسے اس نے فرحت کی خیالی تصویروں سے آباد کیا تھا ویران ہو چکا تھا۔

○

برآمدے کے دوسرے کونے میں صابر اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔معظم علی نے آگے بڑھ کر اسے جگایا۔صابر بدحواسی کی حالت میں اٹھا اور بے اختیار معظم علی سے لپٹ گیا۔وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی اس کی سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔اور پھر جب اس نے سنبھل کر اپنی تباہی کی داستان سنانے کی کوشش کی تو معظم علی نے کہا۔

صابر مجھے سب معلوم ہے۔

صابر نے کہا۔آپ کی امی جان بیمار ہیں۔چلیے وہ اس کمرے میں ہیں۔معظم

علی نے کہا۔وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔

صابر چند ثانیے بے حس وحرکت کھڑا معظم کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا باہر نکل آیا

۔

تھوڑی دیر بعد محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں اور معظم علی دیوان خانے کے برآمدے میں محلے کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔حسین بیگ لاٹھی ٹیکتا ہوا مکان کے اندر داخل ہوا ۔وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا اور کمزوری کے باعث اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں ۔افضل اور فرح کے باپ کی یہ حالت معظم علی کے لیے ناقابل برداشت تھی ۔وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور حسین بیگ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

معظم علی نے کہا چچا جان ۔آپ کو بخار ہے۔آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا!

حسین بیگ نے جواب دیا ۔بیٹا !اب مجھے قبر میں آرام مل سکتا ہے ۔حسین بیگ کچھ دیر برآمدے کے فرش پر معظم علی کے پاس بیٹھا رہا لیکن محلے کے لوگوں نے اسے مجبور کر کے کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا ۔کچھ دیر بعد جب معظم علی کی والدہ کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔حسین بیگ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن معظم علی نے کہا۔چچا جان !اس حالت میں آپ کو جنازے کے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔آپ گھر جا کر آرام کریں۔

محلے کے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر حسین بیگ کو سہارا دیا اور وہ بادل نخواستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اپنی والدہ کو سپرد خاک کرنے کے بعد معظم علی اپنے گھر جانے کی بجائے مرزا

حسین بیگ کی حویلی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ نچلی منزل کے ایک کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ فرحت اور اس کی والدہ ان کے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ فرحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا تو فرحت کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معظم علی، حسین بیگ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ معظم علی! ہمیں ایک دوسرے کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم پر کیا گزری ہے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تم نوجوان ہو تمھاری ہمت ہمارا آخری سہارا ہے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے کئی دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں تمھارے گھر کھانا بھیج رہا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہیں بیٹھ کر کچھ کھا لو۔

چچا جان مجھے بھوک نہیں۔

مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے خاطر چند نوالے کھالو۔ پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ عابدہ خادمہ سے کہو ان کے لے کھانا لے آئے۔

میں خود لاتی ہوں۔ حسین بیگ کی بیوی یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے کھانا لا کر معظم علی کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ معظم علی نے حسین بیگ کے دوبارہ اصرار کرنے پر با دل نا خواستہ ایک لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا کہ اچانک ایک نوکر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ میر مدن آیا ہے اور اس کے ساتھ مسلح سپاہی ہیں۔

میر مدن، میر جعفر کا بیٹا تھا اور مرزا حسین بیگ اور معظم علی کے لیے اس کی آمد

کوئی معمولی بات نہ تھی۔مرزا حسین بیگ بستر سے اٹھا اوراپنی لاٹھی پکڑ کرلڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔معظم علی نے جلدی سے اٹھ کر ایک بازو پکڑ لیا۔وہ دیوانکانے کے برآمدے میں داخل ہوئے۔نیچے صحن میں میر مدن بیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ دکھائی دیا۔میر مدن اپنی عمر کے لحاظ سے کافی موٹا تھا۔اس کے چہرے سے غرور،عیاری، بے حیائی اورسفاکی مترشح تھی۔وہ مرزا حسین بیگ اور معظم علی کو دیکھ کرآگے بڑھا اوربرآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر بولا۔تمھارا نام معظم علی ہے؟

معظم علی کی خاموشی پر مرزا حسین بیگ نے جواب دیا۔ہاں ان کا نام معظم علی ہے۔میر مدن نے حقارت سے حسین بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔بوڑھے تم خاموش رہو۔

معظم علی نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر انگارہ رکھ دیا گیا ہے۔اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔تم کیا چاہتے ہوں؟

میر مدن نے آگ بگولا ہو کر کہا۔بدتمیز ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم مرشدآباد کیوں آئے ہو۔

معظم علی نے جواب دیا۔مرشدآباد میرا گھر ہے۔

میر میرن نے پوچھا۔کیا میدناپور کے فوجدار نے تمہیں وہاں حاضر ہونے کا حکم نہیں بھیجا تھا؟

میدناپور کے فوجدار نے مجھے وہاں بلایا تھا لیکن اس نے مجھے پلاسی کی جنگ کے حالات نہیں بتائے تھے۔

اوراب تمہیں پلاسی کی جنگ کے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔

ہاں۔

میر میرن نے کہا۔ہم تم سے وفا درار ی حلف لینے آئے ہیں۔

وفا داری کا حلف!میرے جعفر کیلئے؟معظم علی نے تن کر کہا۔

میر میرن نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔بیوقوف تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم کسی اور کے لئے وفا داری کا حلف لینے آئے ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا۔وفا داری کا حلف سنگینوں کے پہرے میں نہیں لیا جاتا۔میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ میر جعفر بنگال کا حکمران ہے۔

سپاہیو!میر میرن پوری قوت سے چلایا۔تم کیا دیکھ رہے ہو۔اسے گرفتار کرلو۔

ٹھہرو!حسین بیگ نے اپناہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔پھروہ دوتین قدم آگے بڑھ کرمیر میرن سے مخاطب ہوا۔میر میرن خدا سے ڈرو۔معظم علی کا باپ اور بھائی اپنے خون سے تمہارے باپ کی غداری کی قیمت ادا کر چکے ہیں۔

میر میرن نے انتہائی غضب کی حالت میں آگے بڑھ کر حسین بیگ کے منہ پر تھپڑ مارااوروہ برآمدے کی سیڑھیوں پر گر پڑا۔

آن کی آن میں معظم علی نے یکے بعد دیگر میر مدن کے منہ پر گھونسے رسید کیے میر میرن تیورا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔

سپاہیوں نے تلواریں سونت لیں لیکن میر میرن چلایا۔خبردار!میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔چند سپاہی تلواریں پھینک کرمعظم علی پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔میر میرن کے حکم سے معظم علی کو صحن کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گاے۔میر میرن نے اس کی قمض نوچ کر پھینک دی اورایک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا لے کر کہا۔تمہارے جیسے باغیوں کی سزا موت نہیں۔تمھاری سزا یہ

ہے! کہواب وفا داری کا حلف اٹھاتے ہو یا نہیں؟

جب معظم علی پر کوڑے برسائے جا رہے تھے تو مرزا حسین بیگ نے اٹھ کر مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن ایک سپاہی نے اپنی تلوار کی نود سے سینے پر رکھ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اچانک فرحت کمرے سے نکلی اور بھاگ کر معظم علی اور میر میرن کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ میر میرن نے کوڑا بلند کیا تو وہ آگے بڑھ کر معظم علی کیلئے ڈھال بن گئی۔ میر میرن نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کوڑے کا ایک سرا پکڑ لیا۔ دو سپاہیوں نے فرحت کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ان کی گرفت میں بے بس ہو کر چلا رہی تھی۔ تم کمینے ہو۔ تم بزدل ہو۔ ایک آدمی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شیر بن گئے ہو۔

میر میرن نے پے در پے معظم علی کو چند اور کوڑے لگائے اور جب اس نے بیہوش ہو کر گردن ڈھیلی چھوڑ دی تو اس نے سپاہیوں سے کہا۔ اسے قید خانے لے چلو۔ پھر وہ آگے بڑھ کر حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ تم بوڑھے ہو اور راجا جان کا مجھے حکم دیا تھا کہ تم پر سختی نہ کی جائے لیکن اب ہمارے دشمنوں کے لیے بنگال میں کوئی جگہ نہیں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم ایک ہفتے کے اندر اندر بنگال کی حدود سے نکل جاؤ۔

○

معظم علی کو ہوش آیا تو وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا۔ دو مسلح سپاہی اس کے سر پر کھڑے تھے اور ایک تیسرا پانی کی بالٹی سے کپڑا بھگو بھگو کر اس کے زخموں پر ڈال رہا تھا۔ معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پانی مانگا۔ ایک سپاہی نے

کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کے گھڑے سے پانی کا ایک پیالہ بھر کر اسے دیا۔معظم علی نے پانی پینے کے بعد سپاہیوں کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔میں کہاں ہوں؟

ایک سپاہی نے جواب دیا۔تم مرشد آباد کے قید خانے میں ہو۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔تھوڑی دیر بعد سپاہی جا چکے تھے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔وہ انتہائی کرب کی حالت میں منہ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔

قید و بند کی صعوبتیں اس کے لیے نئی نہ تھیں۔وہ اس سے پہلے بھی قید رہ چکا تھا۔لیکن اس کا المناک پہلو یہ تھا کہ اسے اس سلطنت کا باغی قرار دیا جا چکا تھا۔جس کی آزادی کے لیے اس کا باپ، بھائی اور اس کے دوست شہید ہو چکے تھے۔آٹھ دن کے بعد اس کی کوٹھڑی میں تین اور قیدی دھکیل دیئے گئے۔یہ تینوں بنگال کی فوج کے بڑے بڑے افسر تھے اور ان کی زبانی معظم علی نے ان سے حسین بیگ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی گرفتاری کے دوسرے روز مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے اور حکومت نے ان کے جائداد ضبط کر لی ہے۔ایک افسر نے معظم علی کو علی کو بتایا کہ ان کے ساتھ تیس اور آدمی گرفتار ہوئے ہیں اور ابھی مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔گذشتہ چند دنوں میں مرشد کا قید خانہ بھر چکا ہے۔اور اب قیدیوں کو دوسرے شہروں میں بھیجنے کی تجویز پر غور رہا ہے۔قید ہونے والوں میں نہ صرف حکومت کے باغی ہی نہیں بلکہ وہ متمول لوگ بھی ہیں جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ میر جعفر کو بڑی بڑی رقومات پیش نہیں کر سکے۔میر جعفر اپنے انگریز سرپرستوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں مرشد آباد کا خزانہ ان کے حوالے کر چکا ہے۔اور اب لارڈ کلایو کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لیے اس نے بنگال کے امراء کو بے تحاشا لوٹنا شروع

کر دیا ہے۔ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔

معظم علی کو مرشد آباد کے قید خانے میں اڑھائی مہینے گزر گئے۔ ایک دن قید خانے کا داروغہ چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ اس کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ معظم علی آج تمہارا مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔

معظم علی ننگی تلواروں کے پہرے میں اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا اور داروغہ کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قید خانے کے ایک کشادہ کمرے میں کھڑا تھا اور اس کے سامنے عدالت کی کرسی پر میر جعفر کے خاندان کا ایک فوجی افسر، میر ناصر رونق افروز تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار اور فوجی افسر بیٹھے تھے۔ میر ناصر، اڑیسہ کی بعض لڑائیوں میں معظم علی کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سامنے میز سے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھنے کے بعد کہا۔ معظم علی تمہارے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ تم میدنا پور کے فوجدار کا حکم ملنے پر وہاں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد آ گئے تھے۔ تمہارے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا اور تمہارے خلاف تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے گرفتاری کے وقت میر میرن پر حملہ کیا تھا۔ یہ تینوں الزامات بے حد سنگین ہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟

معظم علی نے پہلے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے ان پہریداروں کی طرف دیکھا جو ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے اور پھر کرسی عدالت کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ میں جانتا

ہوں کہ اس عدالت میں آپ مجھ سے زیادہ بے بس ہیں۔اس لیے صفائی پیش کر کے آپ کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ مجھے سرحدی قلعے سے میدنا پور روانہ ہوتے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے جس حکومت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ایک ایسی حکومت کا نمائندہ ہے جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ اسکے بعد مرشد آباد میں ایسے لوگ مجھ سے وفاداری کا حلف لینا چاہتے تھے جن کے ہاتھ بنگال کی حریت پسندوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔مجھ پر تیسرا الزام یہ ہے کہ میں نے میرمیرن پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میرمیرن میرے نزدیک بنگال کے جائز حکمران کا بیٹا نہیں تھا۔بلکہ ایسا بدزبان اور بداخلاق آدمی تھا جس نے میرے قوم کے ایک ایسے بزرگ پر ہاتھ اٹھایا تھا جس کے نوجوان بیٹے بنگال کی آزادی کے لیے اپنے خون پیش کر چکے ہیں میرا اصلی جرم یہ ہے کہ میں نے بنگال میں جنم لیا اور پھر ایک سپاہی کی حیثیت میں اس قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔جس کے امرا اسے چند ٹکوں میں فروخت کرنے کے لیے تیار تھے۔

میر ناصر نے کہا۔معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی سے بہت تنگ آ چکے ہو۔یہ جگہ ایسی تقریروں کے لیے موزوں نہیں تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔

میں ایک ایسی عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا انسانیت کی توہین سمجھتا ہوں جو مجھ سے زیادہ بے بس ہے۔میر جعفر کو اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔میں آپ کی زبان سے اپنے متعلق ان کا حکم سننے کے لیے تیار ہوں۔

میر ناصر کچھ دیر گردن جھکا کر سوچتا رہا۔بالآخر اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر چند

سطور لکھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔تمہارے جرائم نہایت سنگین ہیں لیکن تمہارے خاندان کی گذشتہ خدمات کے پیش نظر تم کو سات سال سزا دی جاتی ہے۔

معظم علی نے ایک کرب انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میر ناصر کی طرف دیکھا اور میر ناصل نے اپنی گردن جھکالی۔

معظم علی نے مڑ کر قید خانے کے داروغہ کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا ۔داروغہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے منہ پھیرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔اسے لے چلو۔

رات کے وقت جب قید خانے کی کوٹھری میں معظم علی کے ساتھی گہری نیند سو رہے تھے تو وہ سر بسجود ہو کر انتہائی انکسار کے ساتھ یہ دعا مانگ رہا تھا۔میرے مولیٰ مجھے ہمت دے کہ میں اس آزمائش میں پورا اتر سکوں۔

آٹھ مہینے اور گزر گئے ۔اس عرصہ میں معظم علی کے ساتھ کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے اور رہ وقت وہ قید خانے سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔

دسواں باب

ایک رات اچانک معظم علی کی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے جس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔اندر جھانکتے ہوئے کہا۔آپ باہر آئیں۔

معظم علی باہر نکلا تو چار مسلح سپاہیوں کے علاوہ قید خانے کا داروغہ اور میر ناصر دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔میر ناصر نے کہا۔معظم علی میں تمہیں کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہوں۔اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے تو تمہیں بیڑیاں پہننے کی تکلیف نہ دی جائے۔

معظم علی نے سوال کیا۔آپ کو میرے وعدے پر اعتبار آ جائے گا؟

ہاں میر ناصر نے جواب دیا۔

آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟

میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

معظم علی نے داروغہ کی طرف دیکھا اور کہا۔میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بے بس ہیں۔لیکن اگر قید خانے سے باہر میر میرن میرا انتظار کر رہا ہے تو آپ کو کسی جھجک کے بغیر یہ بات کہہ دینی چاہیے۔

داروغہ نے بجائے ناصر نے کہا۔میں آپ کو صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نیک ارادے سے یہاں آیا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔موجودہ حالات میں اگر اس ملک میں نیکی کا تصور باقی رہ گیا ہے۔تو یہ ایک معجزہ ہے۔بہر حال میں اس مجبوری کی حالت میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا چلیے!

معظم علی،میر ناصر کے ساتھ قید خانے کے پھاٹک سے باہر نکلا تو دو سپاہی

بندوقیں اٹھائے سامنے کھڑے تھے اس نے جواب طلب نگاہوں سے میر ناصر کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے وعدے پر اعتبار ہے لیکن اگر آپ غلطی کر بیٹھیں تو آپ کی جگہ میں عمر بھر قید کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ آدمی ہمارے پیچھے آئیں گے اور آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں بہترین نشانہ باز ہیں۔

معظم علی نے میر ناصر کے ساتھ چلنے کے بعد اچانک سوال کیا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہون کہ انہیں یہاں سے کتنی دور نشانہ بازی کا حکم دیا جائے گا۔

میر ناصر نے جواب دیا۔ معظم علی گھبراؤ نہیں۔ تمہیں میر قاسم نے بلایا ہے۔

میر قاسم کون، میر جعفر کا داماد؟

ہاں، میں اکثر ان سے تمہارا ذکر کیا کرتا تھا۔ آج انہوں نے تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر تم عقلمندی کا ثبوت دو تو مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے نتائج تمہارے حق میں بُرے نہیں ہوں گے۔

معظم علی نے کہا۔ اگر میر قاسم یہ سمجھتا ہے کہ قید میں رہ کر میر جعفر کی حکومت کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں تو اسے مایوسی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے یہیں سے واپس لے چلیں۔

ہوسکتا ہے کہ میر قاسم کو تمھارے استقلال نے متاثر کیا ہو اور بنگال اور میر جعفر کے متعلق اب اس کے خیالات بھی وہی ہوں جو تمھارے ہیں

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد معظم علی اور میر ناصر، قاسم کے عالیشان مکان میں داخل ہوئے۔ دیوان خانے کے قریب ایک روشن کمرے کے سامنے پہنچ کر سپاہی رک گئے اور میر ناصر اور معظم علی کمرے میں داخل ہوئے۔ میر قاسم ایک کرسی پر بیٹھا

ہوا تھا۔میر ناصر نے کہا۔یہ معظم علی ہے!

میر قاسم نے معظم کی طرف متوجہ ہو کہا بیٹھ جاؤ!

معظم علی کو کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک قیدی کو بوسیدہ لباس پہنے ہوئے ہے۔میر قاسم کچھ دیر بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے کہا۔معظم علی میں تمہارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔اور میں نے قید خانہ کے داروغہ کو ہدایت کی تھی کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔مجھے افسوس ہے کہ جو لوگ سونے میں تولے جانے کے قابل تھے وہ قید خانے میں سڑ رہے ہیں۔بنگال کی ومزید تباہی سے بچانے کی اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اسے میر جعفر کی حکومت سے نجات دلائی جائے۔میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس تباہی کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن ہم غلط فہمی اور غلط اندیشی میں مبتلا تھے۔ہمارا خیال تھا کہ میر جعفر حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے بعد ایک اچھا حکمران ثابت ہوگا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی حکومت بنگال کے لیے ایک لعنت ہے۔وہ ایک کولھو ہے جس سے انگریز بنگال کے عوام کا خون نچوڑنے کا کال لے رہے ہیں۔اس نے بنگال کی بہترین اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔بنگال کی امراء کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر یہاں سے ہجرت کر رہے ہیں۔میں نے فوج کے محب وطن نوجوانوں سے بات چیت کی ہے۔وہ میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور میرے ساتھ تعاون کے لیے ان کی پہلی شرط یہ ہے کہ میں تم جیسے لوگوں کو قید سے رہا کروانے کی کوشش کروں۔

معظم علی نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا۔میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پہلے آپ کو انگریز کے ساتھ لڑنا پڑے گا اور انگریز کے ساتھ لڑنے کے لیے فوج

کے چند افسروں کا تعاون کافی نہیں۔اس کے لیے عوام کو بیدار اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

میر قاسم مسکرایا۔موجودہ حالات میں انگریز کے ساتھ لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لارڈ کلایو خود میر جعفر سے تنگ آ چکا ہے۔

معظم علی نے کہا۔اوراب ہو میر جعفر کی جگہ آپ کو گدی پر بٹھانا چاہتا ہے؟

میر قاسم نے جواب دیا۔ میں تمہیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر ہم میر جعفر کو گدی سے اتارنے کے لیے تیار ہو جائیں اور لارڈ کلایو کو یہ احساس دلا سکیں کہ اُمراء،سپاہی اور عوام ہمارے ساتھ ہیں تو وہ میر جعفر کا ساتھ دینا پسند نہ کرے گا۔

معظم علی نے کہا۔تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو میر جعفر کی نسبت زیادہ کارآمد سمجھتا ہے؟

میر قاسم نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔تم ایک ذہین آدم،ہو تم جانتے ہو کہ موجودہ حالات میں ہم اس قابل نہیں کہ انگریز کے ساتھ ٹکر لے سکیں۔لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے حکومت کا موقع ملا اور تمہارے جیسے لوگوں نے میرا ساتھ دیا تو میں بہت جلد ایک ایسی طاقت منظم کر سکوں گا جو اس ملک کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر سکے۔

معظم علی مسکرایا۔آپ انگریزوں کی سرپرستی میں اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر ان کے خلاف لڑنے والی فوج منظم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ لارڈ کلایو آپ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوگا۔دیکھئے میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔اگر آپ نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میر جعفر کی حکومت پر مطمئن ہو؟

میں کسی ایسی حکومت پر مطمئن نہیں ہو سکتا جسے لارڈ کلایو کی سر پرستی حاصل ہو۔ میں ایک سوراخ میں دوبارہ ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کروں گا۔

میر قاسم نے مایوس ہو کر کہا۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تمام عمر قید خانہ میں رہنا پسند کرتے ہو؟

معظم علی نے جواب دیا۔ میں چھوٹے قید خانے سے نکل کر بڑے قید خانے میں نہیں آنا چاہتا۔

میر قاسم نے کچھ سوچ کر کہا۔فرض کرو اگر میں اپنی ذمہ داری پر تمہیں قید سے آزاد کر دوں تو تم کیا کرو گے؟

میں موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔اب مجھے بنگال کی آب وہوا راس نہیں ائے گی۔

میر قاسم نے کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کی بعد کہا۔اگر اب تمہیں واپس قید خانے میں بھیج دیا جائے تو کیا میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں۔کسی اور پر ظاہر نہیں ہوں گی؟

ہاں! اور اگر آپ واقعی میر جعفر کی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے ہیں تو قید خانے میں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی پھر جس دن مجھے معلوم ہو گا کہ آپ انگریزوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کے مجھے قید سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔

میر قاسم نے سوال کیا۔اگر تمہیں اس وقت آزاد کر دیا جائے تو تم کہاں جاؤ گے؟

یہ مجھے معلوم نہیں لیکن بنگال میں نہیں رہوں گا۔

جاؤ تم آزاد ہو!

معظم علی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اور وہ مسرت اور استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میر قاسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میر قاسم نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔میں کہتا ہوں کہ تم آزاد ہو۔اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں آزاد کیا ہے تو سنو۔پلاسی کی جنگ کے بعد میں نے تم جیسے کئی نوجوانوں کو بغاوت کی سزا پاتے دیکھا اور میں ہمیشہ دل کو یہ تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ ہمارے خاندان کے دشمن ہیں لیکن آج بنگال پر ہمارا خاندان نہیں بلکہ انگریز حکمران ہے۔ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک معمولی کلرک میر جعفر کی نسبت زیادہ اختیارات کا مالک ہے۔اگر آج سے چند ماہ قبل کوئی شخص تمہاری طرح میری طرف گستاخ نگاہوں سے دیکھتا تو میں اس کی آنکھیں نکال لیتا لیکن اب ہم ہر ذلت کے عادی ہو چکے ہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے ادنٰی ملازم ہمیں آواز دے کر بلانے کی بجائے انگلی کے اشاروں سے بلاتے ہیں۔تم خوش قسمت ہو کہ تم ایک قیدی کے لباس میں بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہو۔کاش میں بھی اس طرح لارڈ کلایو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا۔تم جا سکتے ہو۔مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے انگریزوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتا لیکن یاد رکھو! جب کبھی موقع آئے گا ہم ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔

پھر وہ ناصر کی طرف متوجہ ہوا۔ناصر! تم نے شرط جیت لی ہے۔انہیں لے جاؤ

اور میرے نوکروں سے کہو انہیں نیا لباس اور گھوڑا دے دیں۔ انہیں مرشد آباد کے باہر پہنچانا تمھاری ذمہ داری ہے۔

کمرے سے باہر نکلتے وقت معظم علی، میر قاسم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا ۔کمرے سے باہر نکل کر اس نے میر ناصر سے سوال کیا۔آپ نے میر قاسم سے کون سی شرط جیتی ہے؟

میر ناصر نے جواب دیا۔میر قاسم کا خیال تھا کہ آپ قید سے رہائی کی اُمید پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور میری رائے اس کے خلاف تھی۔ انہوں نے مذاق میں کہا تھا کہ اگر معظم علی مجھے دیکھتے ہی میرے پاؤں پر نہ گر پڑا تو میں تمہیں دس اشرفیاں انعام دوں گا اور میں نے یہ کہا تھا کہ جس معظم علی کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا تھا وہ اور ہے۔وہ ان لوگوں میں سے ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی نے کہا۔میں اپنی رہائی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں ۔لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ میر جعفر اور میر میرن کو جب میرے متعلق معلوم ہو گا تو آپ لوگ کیا جواب دیں گے؟

میر جعفر اور میر میرن ان دنوں انگریزوں کے لیے روپیہ جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے اور پھر میر قاسم اتنے بے اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے ایک قیدی بھی رہا نہ کر سکیں ۔میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ فوراً مرشد آباد سے نکل جائیں اور جلد از جلد بنگال کی سرحد عبور کر لیں ۔ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دو دن بعد یہ خبر مشہور کرنی پڑے کہ ایک خطرناک قیدی کو پھانسی دے دی گئی ہے ۔میر قسم کے سپاہی آپ کو شہر کے باہر چھوڑ آئیں گے۔

معظم علی نے کہا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں یہاں سے تنہا جاؤں۔ میرے ساتھ سپاہی دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ میرے طرف متوجہ ہوں گے۔ میرا تنہا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں شہر چھوڑنے سے پہلے چند منٹ کے لیے اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔

میر ناصر نے کہا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ آپ کا گھر نیلام ہو چکا ہے اور اب وہاں کوئی اور رہتا ہے۔

معظم علی نے کہا۔ میں اپنے نوکر کو تلاش کیے بغیر نہیں جا سکتا۔ محلے میں میرے کئی دوست ہیں شاید انہیں اس کا پتہ ہو۔ میرے لیے وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر میں پکڑا گیا تو آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ نے قید سے نکالا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

میر ناصر نے کہا۔ اگر نوکر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے تو میں آپ کو نہیں روک سکتا لیکن آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بہت سے قیدیوں کو رہا کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔

میں پوری احتیاط کروں گا۔ اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہون کہ مرزا حسین بیگ مرشد آباد سے ہجرت کرنے کے بعد کہاں گئے تھے؟

میں ان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ لکھنوء کی طرف جا رہا تھا اور قافلے میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو لکھنوء سے آگے آگرہ، دہلی اور حیدر آباد جانا چاہتے تھے۔

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ میر ناصر نے کہا۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ میں آپ کے لیے نئے لباس اور گھوڑے کا انتظام

کرتا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو مجھے ایک خنجر کی بھی ضرورت ہے۔

میر ناصر نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا۔ میں آپ کو خنجر کے علاوہ بندوق اور پستول بھی دے سکتا ہون۔

○

قریباً ایک گھنٹہ بعد معظم علی ایک فوجی افسر کا لباس پہنے اپنے محلے کے ایک سنسان گلی میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔

عبداللہ خان! دروازہ کھولو۔

ما کان کا دروازہ کھلا اور معظم علی نے جلدی لیس اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ عبد اللہ میں معظم علی ہوں۔

عبداللہ خاں چند ثانیے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں معظم علی نے اپنا گھوڑا اندر کھینچ کر دروازہ بند کرلیا۔

عبداللہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور بولا مجھے ابھی بھی یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔ باتوں کا وقت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ صابر کہاں ہے؟

صابر آپ کے مکان میں رہتا ہے۔ آپ کی گرفتاری کے بعد حکومت نے آپکا مکان نیلام کر دیا تھا۔ اب وہاں ایک فوجی افسر مقیم ہے اور صابر اس کے پاس نوکر ہے۔ مرزا حسین بیگ ہجرت کے وقت صابر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے کہا میں مرتے دم تک اس مکان میں معظم علی کا انتظار کروں گا۔

معظم علی نے کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ مکان کے مردانہ حصے میں اس وقت صابر کے ساتھ اور کون ہوگا؟

وہاں اگر کوئی مہمان نہیں تو ایک اور نوکر ضرور ہوگا۔

مکان کی چھت سے ایک عورت نے آواز دی۔ یہ کون ہیں؟

ایک دوست ہیں ۔عبداللہ نے جواب اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا میں نے یہ نہیں پوچھ کہ آپ قید خانے سے اس وقت باہر کیسے نکلے؟

معظم علی نے کہا۔ ان باتوں کا وقت نہیں ۔تم اسی وقت تین چار قابل اعتماد دوستوں کو بلا لاؤ۔ میں یہیں تمھارا انتظار کروں گا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی عبداللہ کے علاوہ اپنے محلے کے چار اور نوجوانوں کے ساتھ جنہوں نے اپنے چہروں کو نقاب ڈال رکھے تھے، اپنے مکان کے دروزے کے سامنے پہنچ کر رکا۔ چاندکی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ دیوار پھاند کر صحن میں داخل ہوا۔ صحن میں اصطبل کے سامنے دو آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے معظم علی دبے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف بڑھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ عبداللہ اور اس کے باقی ساتھی صحن میں داخل ہوئے اور معظم علی کے اشارے پر اصطبل کے سامنے سونے والوں کی کھاٹوں کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ معظم علی نے ایک کھاٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں قوی ہیکل نوجان لیٹا ہوتھا۔ عبداللہ نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر جگایا اور ہاتھ سے منہ بند کرتے ہوئے کہا۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ تم خاموش رہو۔

اپنے گرد مسلح آدمی دیکھ کر س نے مزاحمت کی کوشش نہ کی اور معظم علی کے ساتھیوں نے اسے منہ میں اچھی طرح کپڑا ٹھونس کر اسے چارپائی کے ساتھ جکڑ دیا

۔

اس کے بعد معظم علی نے دوسرے آدمی کو جگایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔صابر خاموش! ڈرو نہیں میں معظم علی ہوں۔

اور صابر کی حیران بے بس اور خاموش نگاہیں ایک ثانیہ کے اندر اندر ہزاروں سوالات کر چکی تھیں ۔ معظم علی نے کہا۔صابر میرے ساتھ آؤ اور باقی سب یہیں ٹھہریں ہم ابھی آتے ہیں۔صابر کچھ کہے بغیر معظم علی کے ساتھ اصطبل میں داخل ہوا۔کھلے دروازوں کے راستے چاند کی روشنی اصطبل کے اندر داخل ہو رہی تھی کھرلی پر دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔معظم علی نے کہا۔صابر تم جلدی سے گھوڑوں پر زین ڈالو۔

اس کے بعد وہ کھرلی کے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور آخری کھونٹے کے قریب بیٹھ گیا۔جب صابر گھوڑوں پر زین ڈالنے کے بطعد اس کے پاس آیا تو وہ خنجر سے زمین کھود رہا تھا۔

آپ کیا کر رہے ہیں؟ صابر نے پریشان ہو کر کہا۔

صابر میں چوری کر رہا ہوں۔

چوری! کس چیز کی چوری؟

میں اپنے گھر میں اپنے مال کی چوری کر رہا ہوں۔تم گھوڑے باہر لے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

صابر گھوڑے کی باگ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنی بغل میں ایک چھوٹی سے تھیلی دبائے باہر نکلا تو اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا۔یہ کیا ہے؟

یہ ہمارا زادِراہ ہے۔آؤاب چلیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد محلے سے باہر معظم علی اور صابر گھوڑوں پر سوار ہوکر عبداللہ اور دوسرے دوستوں کوخدا حافظ کہہ رہے تھے۔

عبداللہ نے آبدیدہ ہوکرسوال کیا۔آپ کی منزل کہاں ہے؟

معظم علی نے جواب دیا۔میں ایک ایسا مسافر ہوں جس کی جوی منزل نہیں ۔میں مرزاحسین بیگ کی تلاش میں جارہاہوں۔اگرلکھنومیں نہ ملےتو میں دلی جاؤں گا۔اگروہاں بھی نہ ملےتو مجھے حیدرآباد جانا ہوگا۔اس کے بعد معظم خدامعلوم مجھے کن کن شہروں اوربستیوں کی خاک چھاننی پڑے۔

عبداللہ خاں نے کہا۔میں آپ کوایک بات بتانا بھول گیا تھا۔آپ کی گرفتاری کےکوئی چھ مہینے بعداکبرخاں یہاں آیا تھاوہ دودن میرے پاس ٹھہرا تھا اور جاتے ووقت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگرخدا نے مجھےتوفیق کی تو میں ایک فوج لے کرمرشدآباد آؤں گااور معظم بھائی کوقید سےنکالوں گا۔

معظم علی نےسوال کیا۔تم نے اس سے مرزاحسین بیگ کے متعلق پوچھاتھا؟

ہاں،لیکن مرزاحسین بیگ کے متعلق وہ بھی بےخبرتھااوراس نے یہ کہا تھا کہ میں لکھنوجاکرانہیں تلاش کروں گااوراگروہ مل گئےتو انہیں اپنے گھرلے جانے کی کوشش کروں گا۔

صابر نے کہا۔اکبرخاں مجھےبھی ساتھ لے جانا چاہتا تھالیکن میں نے جواب دےاکہ میں مرتے دم تک اپنے آقا کاانتظارکروں گا۔

گھوڑے پرسوارہوتے وقت معظم علی نے عبداللہ اوراس کے ساتھیوں سے کہا۔آپ لوگ میرے فرارہونے کے متعلق محلے کےکسی آدم سے ذکرتک نہ کریں۔میر

جعفر کے آدمیوں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ یقیناً ہمارا پیچھا کریں گے۔

علی الصباح معظم علی اور صابر نے ایک برساتی ندی کے کنارے گھوڑوں سے اتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ یہ آنسو لٹے ہوئے مایوس اور بے بس انسان کی آخری پونجی تھے جسے وہ پانے وطن کی خاک پر نچھاور کر رہا تھا۔ معظم علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ جزا اور سزا کے مالک میرے بدنصیب قوم کو چند افراد کی بداعمالیوں کی سزا نہ دے۔ ہمیں ان ملت فروشوں سے نجات دلا جنہوں نے تیرے بندوں کو تیری رحمت سے مایوس کر دیا ہے۔

○

آپ مرزا حسین بیگ کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ وہ مرشد آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے لکھنو آئے تھے۔ شاید یہاں ان کے کوئی رشتہ دار تھے۔ آپ کسی ایسے آدمی کا پتہ دے سکتے ہیں جو پلاسی کی جنگ کے بعد مرشد آباد سے ہجرت کر کے لکھنو میں آباد ہوا ہو۔ یہ سوالات تھے جو معظم علی لکھنوء میں چند دن قیام کے دوران سینکڑوں آدمیوں سے پوچھ چکا تھا لیکن کہیں سے اسے تسلی بخش جواب نہ ملا۔

لکھنو پہنچ کر معظم علی نے دو دن ایک سرائے میں گزارے، تیسرے دن اس نے اپنی تھیلی سے ایک ہیرا نکالا اور بارہ سو اشرفی کے عوض لکھنوء کے ایک جوہری کے پاس فروخت کر دیا۔ اسی شام اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اس کے بعد اس کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھتا اور پنے تکیے کے نیچے سے جواہرات کی تھیلی نکال کر اپنی کمر میں باندھ لیتا اور پھر محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنے

کے بعد حسین بیگ کی تلاش میں نکل جاتا۔ زیورات اس نے ایک صندوق میں بند کر دیئے تھے اور اس کی حفاظت صابر کے سپرد کر دی تھی۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کے لیے اس نے ایک نوکر رکھ لیا تھا جس کا نام دلاور خاں تھا۔ سارا دن شہر کے محلوں اور گلیوں میں حسین بیگ کو تلاش کے بعد شام کو تھکاوٹ سے زیادہ مایوسی سے نڈھال ہو کر وہ گھر آتا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ ہیروں کی تھیلی کمر سے کھول کر تکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ صابر کے سوا کسی کو اس کی دولت کا علم نہ تھا۔ اپنے خزانے کا سب سے چھوٹا ہیرا فروخت کرنے کے بعد معظم علی کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ملک کے چند امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہے لیکن اس دولت کے ساتھ ماضی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔

ایک امیر آدمی کے لباس میں اس لکھنوء کے روسا، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ دس دن کے پیہم جستجو کے بعد ایک دوپہر وہ لکھنوء کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ آدمی اس کے سامنے آ کر اچانک رُکا اور اس کی طرف بغور دیکھنے کے بعد معظم علی! معظم کہتا ہوا لپٹ گیا۔

آپ شیر علی ہیں؟ معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

ہاں۔ اس نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے آسانی سے نہیں پہچانو گے۔ مجھے یہاں مرشد آباد کے کئی آدمی ملے ہیں۔ لیکن ایک دو کے سوا مجھے کوئی نہیں پہچان سکا اور تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ تم قید سے کب رہا ہوئے اور یہاں کب آئے؟

میں کوئی دس روز سے یہاں ہوں اور مرزا حسین بیگ کو تلاش کر رہا ہوں۔

شاید آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو؟

شیر علی نے جواب دیا۔مرزا صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شیر علی نے کہا۔میں ان سے ایک ماہ بعد مرشد آباد سے ہجرت کی تھی۔لکھنوء پہنچ کر مجھے چند ایسے آدمی ملے جو مرشد آباد سے مرزا صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔مجھے ان کی زبانی پتہ چلا کہ مرزا صاحب اودھ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بیمار ہو گئے تھے اور ایک بستی کی زمیندار نے انہیں اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔لکھنوء میں مرزا صاحب کے ایک ماموں زاد بھائی رہتے تھے اور میرا خیال تھا کہ مرزا صاحب ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب میں نے انہیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پلاسی کی جنگ سے چند ماہ قبل لکھنوء سے ہجرت کر کے دکن جا چکے ہیں۔پھر میں نے اس بستی کا رخ کیا جہاں مرزا صاحب کے ٹھہرنے کی اطلاع ملی تھی لیکن وہاں پہنچ کر گاؤں کے زمیندار سے یہ خبر سنی کہ وہ چار دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئے تھے اور انہیں گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔گاؤں کے زمیندار نے مجھے ان کی قبر بھی دکھائی تھی۔

معظم علی نے کہا لیکن ان کے ساتھ ان کی بیوی اور لڑکی بھی تھیں؟

انہیں گاؤں کے زمیندار نے چند دن اپنے پاس مہمان رکھا تھا۔اس کے بعد بنگال سے تارکان وطن کا ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا۔وہ اس قافلے کے ساتھ شامل ہو گئیں۔اس قافلے میں بعض آدمی لکھنوء اور فیض آباد اور بعض آگرہ اور دلی جانے والے تھے۔میں نے لکھنوواپس آ کر پتہ کیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ان کے ساتھ دو نوکر بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنوء سے اپنے عزیزوں کا پتہ کرنے کے بعد دلی یا حیدرآباد جا چکی ہیں ۔کیونکہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد ان دنوں شہروں میں ہیں

معظم علی نے سوال کیا۔آپ کو مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی کا نام معلوم ہے؟

ہاں ۔ان کا نام راشد بیگ تھا۔

آپ کو دہلی میں اس کے کسی رشتہ دار کا نام معلوم ہے؟

نہیں ۔

شیر علی کا لباس اس کی مفلسی اور تنگ دستی کا آئینہ دار تھا۔

معظم علی نے پوچھا ۔یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟

شیر علی نے جواب دیا ۔کچھ نہیں ۔ جب میں مرشد آباد سے آیا تھا تو میرے پاس کچھ روپیہ تھا ۔ یہاں ایک ساتھی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم بنارس چل کر کوئی کاروبار شروع کریں ۔بنارس جا کر میں تجارت میں نفع کمانے کی بجائے اپنی رہی سہی پونجی بھی گنوا بیٹھا اور اب کسی ملازمت کی تلاش میں ہون ۔لیکن یہاں ایک بوڑھے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔

معظم علی نے کہا۔آپ کو ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں چلیے میرے ساتھ۔

کہاں؟

میرے مکان پر

لیکن میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔پہلے یہ بتائیے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا۔میں ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو ممکن ہے میں آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔

لیکن تجارت کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے؟

سرمائے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔میرے پاس بہت کچھ ہے۔

شیر علی نے کہا۔میں اپنی خاطر آپ کو تجارت کا مشورہ نہیں دوں گا۔آپ ایک سپاہی ہیں اور تجربے اور ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اودھ کی فوج میں بہترین عہدہ حاسل کر سکتے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔چچا شیر علی خدا کے لیے فوج کی ملازمت کا ذکر نہ کیجیے۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ باقی عمر ان نام نہاد حکمرانوں کے لیے تلوار نہیں اٹھاوں گا۔ جنہوں نے قوم کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔

معظم علی نے دو ہفتے اور لکھنوء میں قیام کیا۔اس عرصہ میں وہ صبح سے شام تک فرحت اور اس کی ماں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔رات کا وقت جب کبھی شیر علی کو اس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہتا۔معظم اگر تمہارے پاس قارون کا خزانہ ہو تو بھی ہمیں بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ہمیں کوئی نہ کوئی کام ضرور کرنا پڑے گا۔معظم علی جواب دیتا۔ہاں چچا جان میں سوچ رہا ہوں۔آپ پریشان نہ ہوں۔آپ کی بہت جلد کسی کام پر لگا دیا جائے گا۔

ایک رات تیسرے پہر شیر علی سو رہا تھا۔معظم علی نے اسے جگا دیا اور کہا۔چچا شیر علی میں کچھ عرصے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔دلاور خاں میرے ساتھ جائے گا اور صابر آپ کی خدمت میں رہے گا۔یہ لیجیے اس تھیلی میں پانچ سو اشرفیاں ہیں۔میری

غیر حاضری میں آپ کے اخراجات کے لیے یہ کافی ہوں گی۔

آپ کہاں جا رہے ہیں؟شیر علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

میرا مقصد فرحت اور اس کی والدہ کو تلاش کرنا ہے۔میں پہلے فیض آباد جاؤں گا۔اس کے بعد روہیلکھنڈ ایک دوست کے پاس جاؤں گا۔پھر ممکن ہے مجھے آگرہ، دلی اور حیدر آباد کی خاک چھاننی پڑے۔

شیر علی نے کہا۔اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔

نہیں۔اس عمر میں آپ کے لیے اتنا طویل سفر ٹھیک نہیں۔میرے واپسی تک آپ یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمیں کون سا کاروبار شروع کرنا چاہیے۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور دلاور خان گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔اور شیر علی اور صابر مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے انہیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ دلاور خاں کوئی چالیس برس کا یک دراز قامت،قوی ہیکل آدمی تھا اور چند دنوں میں معظم علی کا قابل اعتماد ساتھی بن چکا تھا۔

○

گھنے جنگل میں غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہی شام کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور اس نے مغموم فضا میں معظم علی اور دلاور خاں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں پر معمولی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے کہ کبھی کبھی کوئی گیدڑ، خرگوش، ہرن یا بھیڑیا گھنے درختوں سے نمودار ہوتا اور پگڈنڈی عبور کر کے دوسری طرف روپوش ہو جاتا۔

ایک چھوٹی سی ندی عبور کرنے کے بعد معظم علی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ یہاں سے تھوڑی دور آگے دائیں ہاتھ ایک اور پگڈنڈی آئے گی جو اکبر خاں کے گاؤں کو جاتی ہے۔ذرا خیال رکھنا اگر ہم اس پگڈنڈی سے آگے نکل گئے تو ساری

رات جنگل میں بھٹکتے رہیں گے۔

دلاور خاں نے جواب دیا۔ جناب بھٹکنے کے لیے یہ جنگل موزوں معلوم نہیں ہوتا اس سے تو یہ بہتر ہے ہم پچھلی بستی میں رک گئے ہوتے۔

معظم علی نے کچھ کہنے کی بجائے ایڑ لگا کر اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک پگڈنڈی دکھائی دی ااور اس نے اپنا گھوڑا موڑتے ہوئے کہا۔ اب ہم پہنچ گئے۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک ٹیلہ ہے۔ ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ا ہم ایک جھیل کے کنارے کنارے تھوڑی دور جائیں گے۔ اس کے بعد ایک بڑا ٹیلہ آئے گا جسے عبور کرنے کے بعد ہم جنگ سے نکل کر اکبر خاں کے گاؤں کے کھیتوں میں داخل ہو جائیں گے۔

دلاور خاں کچھ کہے بغیر معظم علی کے پیچھے ہولیا۔ تنگ، پگڈنڈی پر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے کے قریب پہنچتے ہی گھوڑوں نے ٹھٹھک کر کان کھڑے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ معظم علی اور دلاور خاں پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ انہیں کسی بکرے کی میماہٹ سنائی دی۔ دلاور خاں نے اطمینان سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ اگر یہ کسی ریوڑ سے بچھڑے ہوئے بکرے کی آواز نہیں تو ہم کسی بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں

جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں آس پاس کوئی بستی نہیں اور ایسے جنگل میں بکرے اپنے ریوڑ سے بچھڑنا پسند نہیں کرتے۔ معظم علی نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ بدحواس گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں لیکن ٹیلے کی چوٹی سے کوئی بیس قدم دور پہنچ کر آگے بڑھنے کی بجائے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ معظم علی نے مڑ کر دیکھا تو دلاور خاں کا گھوڑا بھی الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معظم علی نے اپنی

بندوق سنبھال کر گھوڑے سے اتر پڑا اور دلاور خاں نے اس کی تقلید کی۔

معظم علی نے کہا۔تم گھوڑے سنبھالو۔معلوم ہوتا ہے انہیں کسی درندے کی بو آ رگئی ہے۔میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔

دلاور خاں نے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں۔معظم علی نے گھنے جنگل میں ادھر اُدھر دیکھا اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ٹیلے سے آگے ایک چھوٹی سے جھیل تھی اور پگڈنڈی جھیل کے کنارے ایک نصف دائرہ بنانے کے بعد دوسری جانب درختوں میں غائب ہو جاتی تھی۔جھیل کے کنارے سے درخت نسبتاً کم تھے۔بکرے کے کرب انگیز چیخیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔معظم علی نے پیچھے مڑ کر دلاور خاں کو اشارہ کیا اور وہ اچھلتے،کودتے بدکتے ہوئے گھوڑوں کو کھینچتا آگے بڑھا
۔

معظم علی نے کہا۔اگر میں غلطی پر نہیں تو عنقریب ہم کسی شکاری سے ملنے والے ہیں۔بکرا جھیل کے کنارے پگڈنڈی کے پاس ہی کسی درخت کے نیچے بندھا ہوا ہے اور شیر یا چیتا بھی کہیں آس پاس چکر کاٹ رہا ہے۔اب شام ہو رہی ہے ہمارے لیے یہاں سے جلد نکل جانا بہتر ہے۔تم گھوڑوں کو جھیل کے ساتھ ساتھ رکھو اور میں جنگل کی طرف رہوں گا۔

دلاور خاں نے گھوڑوں کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔خدا کی قسم میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن اس بکرے کی ہر چیخ کے ساتھ میرا ایک سیر خون خشک ہوا جاتا ہے۔اگر یہ کوئی بھوت نہیں تو آپ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔

ٹیلے سے نیچے اترتے ہی معظم علی کو اپنے دائیں ہاتھ گھنی جھاڑیوں میں پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔اچانک

درختوں کے درمیان پھیلی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں اسے ایک شیر دکھائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے اپنی بندوق سیدھی کی۔ شیر ایک ثانیہ کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک خوفناک گرج کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ معظم علی نے گولی چلا دی۔ زخمی درندے نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر پوری قوت سے آخری جست لگا کر معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر ڈھیر ہوگیا۔

معظم علی ایک لمحہ کے لیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اپنے تھیلے سے بارود نکال کر بندوق بھرنے لگا۔ ابھی وہ اس سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے پیچھے جھاڑیوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک شیرنی کوئی پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ سے نمودار ہوئی اور دھاڑتی ہوئی معظم علی کی طرف بڑھی۔ معظم علی کے لیے بندوق بھرنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے بندوق پھینک دی اور جلدی سے تلوار نکال کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا پاؤں ایک درخت کی جڑ سے ساتھ ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل کی فضا بندوق کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ معظم علی جو ایک ثانیہ قبل موت کا بھیانک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اٹھا تو اسے صرف چند قدم کے فاصلے پر شیرنی دم توڑتے دکھائی دی۔ پھر اسے ایک دلکش آواز سنائی دی۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔

معظم علی جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک درخت کی آڑ سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور فاتحانہ انداز سے آگے بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔

بھائی جان! وہ قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلایا اور اپنی بندوق پھینک کر بھاگتا

ہوا۔معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا۔

اکبر۔۔تم۔۔۔۔۔تم اتنی جلدی جوان ہو گئے؟

اکبر نے کہا۔بھائی جان شیر مارنے کے بعد آپ کو اس قدر بے پروا نہیں ہونا چاہیے تھا۔یہ شیرنی آپ کے سر پر آچکی تھی۔

معظم علی نے جواب دیا۔میں بندوق بھر رہا تھا۔خدا کا شکر ہے کہ تم بروقت پہنچ گئے۔میں نے بکرے کی چیخیں سن کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جنگل میں کوئی شکاری موجود ہے۔

اکبر خاں نے کہا۔اس جوڑے نے ہمارے کئی مویشی ہلاک کیے ہیں۔اس لیے میں نے آج بکرا بندھوا دیا تھا۔جب آپ ٹیلے سے نیچے اتر رہے تھے میں نے شیر کو آپ کی تاک میں جاتے دیکھا تھا۔میں سمجھتا تھا کہ کوئی مسافر راستہ بھول کر اس طرف آنکلا ہے۔میں آپ کو خبردار کرنے کی نیت سے نیچے اترا لیکن آپ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو چکے تھے،پھر میں بندوق کی آواز سن کر اس طرف بھاگا تو یہ شیرنی نظر آئی۔میں مرشد آباد گیا تھا آپ قید سے کب رہا ہوئے؟

معظم علی نے جواب دیا۔اکبر ہم اس جنگل سے نکل کر اطمینان کے ساتھ باتیں کریں گے۔

چلیے۔اکبر خاں نے کہا۔یہ آپ کا ساتھی کون ہے۔میں نے اسے جھیل کے کنارے بدحواس گھوڑوں سے زور آزمائی کرتے دیکھا ہے۔

وہ میرا نوکر ہے۔

وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر چل پڑے۔راستے میں اکبر خاں کے تین اور ساتھی ساتھ شامل ہو گئے۔جھیل کی طرف دلاور خاں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔

درختوں اور جھاڑیوں سے نکل کر انہیں ایک دلچسپ منظر دکھائی دیا۔ دلاور خاں کنارے سے چند قدم دور جھیل کے اندر وحشت زدہ گھوڑوں کی باگیں پکڑے انہیں بے تحاشہ گالیاں دے رہا تھا۔ ایک دیہاتی جس نے ایک ہاتھ سے بکرے کا رسہ پکڑ رکھا تھا۔ کنارے پر کھڑا مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک گھوڑے نے اچانک اچھل کر دلاور خاں کے ہاتھ سے باگ چھڑا لی اور چند قدم دور نکل گیا۔ دلاور خاں کو اس پریشانی کی حالت میں دیہاتی کی ہنسی بے حد ناگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ ارے یار تم عجیب بیوقوف ہو۔ بھلا یہ ہنسنے کی کونسی بات ہے خدا کے لیے اس بکرے کو یہاں سے لے جاؤ یہ بیوقوف جانور اسے بھی شیر سمجھتے ہیں۔

دیہاتی نے قہقہ لگاتے ہوئے کہا۔ اجی نہیں گھوڑے، بکرے کو شیر نہیں سمجھتے بلکہ تمہیں بھوت سمجھ کر ڈر گئے ہیں۔

دلاور خاں کو انتہائی بے بسی کی حالت میں بھی بھوت کہلانا پسند نہ تھا۔ وہ دیہاتی کو جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ اس کی توجہ معظم علی اور دوسرے آدمیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کا سارا غصہ جاتا رہا اس نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟

معظم علی نے جواب دیا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہم نے دو شیر مار لئے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ تم باہر آجاؤ۔

دلاور خاں نے آزردہ ہو کر کہا۔ وہ جی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیر سے ڈر کر پانی میں گھس گیا تھا۔ خدا کی قسم یہ گھوڑے نہیں گدھے ہیں۔ اگر پھر کبھی ایسا وقت آیا تو میں انہیں سنبھالنے کی بجائے شیر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ

مجھے تیرنا آتا ہے ورنہ آپ کو میری لاش بھی نہ ملتی۔

اکبر خاں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔نہیں بھائی اس طرف جھیل کا پانی زیادہ گہرا نہیں۔اگر تمہیں تیرنا نہ آتا تو بھی ڈوب جانے کا خطرہ نہ تھا۔

معظم علی نے کہا۔دلاور خاں اب تم شور مچانے کی بجائے باہر نکل آؤ تو گھوڑے خودبخود ہمارے پاس آئیں گے۔

نہیں جناب! جب تک یہ بکرا کنارے پر کھڑا ہے۔یہ باہر نہیں نکلیں گے۔

بھئی تم باہر تو نکلو!

دلاور خاں نے بددل ہو کر گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ دیں اور خود پانی سے باہر نکل آیا جب وہ کنارے پر پہنچا تو گھوڑے بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آرہے تھے۔دلاور خاں نے کہا۔خدا کی قسم میرا جی چاہتا ہے کہ ان دونوں کو گولی ماردوں۔

اکبر خاں کے اشارے پر دو آدمیوں نے گھوڑے پکڑ لیے اور یہ لوگ جھیل کے کنارے کنارے پگڈنڈی پر چل دیئے۔شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔جنگل میں گیدڑوں، بھیڑیوں اور دوسرے وحشی جانوروں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم علی، اکبر خاں کے ان گنت سوالات کا جواب میں اسے اپنی قید اور رہائی کی داستان سنا رہا تھا۔جب اسنے سرگذشت ختم کی تو اکبر خاں نے کہا۔اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لکھنوء پہنچ گئے ہیں تو میں فوراً وہاں آتا۔

لکھنوء میں میرا قیام بہت مختصر تھا۔میں وہاں سے فیض آباد چلا گیا تھا اور فیض آباد سے اودھ کے چند شہروں کی خاک چھاننے کے بعد تمہارے پاس آیا ہوں۔میرا خیال تھا کہ شاید تمہیں مرزا صاحب کے متعلق کچھ معلوم ہو۔

اکبر خاں نے مغموم لہجے میں کہا۔کاش مجھے کچھ معلوم ہوتا۔میں نے مرشدآباد سے واپسی پر لکھنوء میں انہیں تلاش کیا تھا۔اب اگر آپ دلی، آگرہ اور حیدا آباد جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

معظم علی نے سوال کیا۔بھائی جان کا کیا حال ہے؟

بھائی جان کو فوت ہوئے قریباً تین مہینے ہو چکے ہیں ہمارے علاقے پر مرہٹوں نے حملہ کر دیا تھا اور وہ لڑائی میں مارے گئے تھے۔

چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔بالآخر اس نے اکبر خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔اکبر مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔

اکبر خان نے کہا بھائیجان نے ایک بہادر کی طرح جان دی تھی۔ان کے جسم پر تین گولیوں کے اور پانچ تلوار کی زخم تھے۔

معظم علی نے پانچ دن اکبر خاں کے گھر قیام کیا۔اس مے بعد جب اس نے آگرہ اور دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر خاں نے اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن معظم علی نے کہا۔اکبر خاں تم اب اپنے علاقے کے سردار ہو۔تمہارے گھر رہنا ضروری ہے۔میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔لیکن تم میرے ساتھ جا کر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

اکبر خاں نے کہا۔بھائی جان میں آپ کی خاطر نہیں جانا چاہتا۔بلکہ مجھے آگرہ اور دلی دیکھنے کا شوق ہے۔میں حیدر آباد بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔یہاں چچا جان کے ہوتے ہوئے میری غیر حاضری بہت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی۔

معظم علی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔بہت اچھا اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو پھر تیار ہو جاؤ ہم پرسوں صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

اکبر خان نے جواب دیا۔ میں بالکل تیار ہوں۔

تیسرے روز رات کے پچھلے پہر اکبر خاں نے معظم علی کو جگایا اور کہا۔ بھائی جان اٹھیے اب صبح ہونے والی ہے۔

معظم علی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں کی قطار دکھائی دی۔ اکبر خاں کا چچا چند مسلح نوجوانوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی نے اکبر خاں سے سوال کیا کیا یہ سب آدمی ہمارے ساتھ جائیں گے؟

چچا جان تو بیس آدمی بھیجنے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں آٹھ آدمی لے جانے پر رضامند کیا ہے۔

اکبر خاں کے چچا نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں زیادہ آدمی لے جانے چاہییں۔

اکبر خاں نے کہا۔ چچا جان ہم دلی دیکھنے جا رہے ہیں۔ دلی لوٹنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔

برخودار! دلی لوٹنے کے لیے تمہیں یہاں سے آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ اگر تم لال قلعہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعلان کرو کہ میں دلی لوٹنے آیا ہوں تو وہیں سے تمہیں ہزاروں مددگار مل جائیں گے۔ تمہیں راستے میں اپنی حفاظت کے لیے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ اکبر خاں کا خیال رکھیں۔ یہ آٹھ آدمی جنہیں میں آپ کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ ہمارے قبیلے کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ خطرے کے وقت آپ ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد گیارہ آدمیوں کا یہ قافلہ گاؤں سے باہر نکل رہا تھا۔

گیارھواں باب

دلی تک سفر کرنے کے دوران میں معظم علی کے تمام خیالات فرحت پر مرکوز تھے۔ وہ راستے کے پررونق شہروں سے مایوس ہو کر نکلتا تو اپنے دل کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا کہ فرحت آگے کسی بستی میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پھر جب اسے بستی کے لوگوں سے مل کر مایوسی ہوتی تو اس کی نگاہیں فرحت کو راستے کے جنگلوں اور بیابانوں میں تلاش کرتیں۔ کبھی کوئی قافلہ نظر پڑتا تو وہ قریب جا کر پوچھتا۔ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ مرشد آباد کا کوئی آدمی تو نہیں؟ مسافر اس کی باتوں پر مسکراتے اور ہنستے گزر جاتے، پھر وہ اکبر خاں سے کہتا۔ اکبر شاید میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے دلی پہنچ کر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن میں خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ اب موہوم امیدیں میری زندگی کا سہارا بن چکی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں خواہ مخواہ اپنے ساتھ لا کر پریشان کیا۔

اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ بھائی جان آپ کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

ایک شام دلی سے دو منزل ادھر وہ ایک چھوٹی سے بستی میں داخل ہوئے۔ بستی اک چودھری ایک شریف النفس راجپوت تھا۔ اس نے انہیں اپنے پاس ٹھہرالیا۔ جب معظم علی نے اسے یہ بتایا کہ میں اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی تلاش میں دلی جا رہا ہوں، تو عمر رسیدہ میزبان نے کہا۔ برخودار مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ لوگ اس شان و شوکت کے ساتھ دلی گئے تو آپ کے باقی عزیز شاید تمام عمر آپ کو تلاش کرتے رہیں۔ دلی پر اب مرہٹوں کا راج ہے۔ وہاں آپ کا لباس، آپ کے

گھوڑے اور آپ کے ہتھیار آپ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ پھر اگر آپ مرہٹوں کی نگاہ سے بچ کر شہر میں داخل ہو جائیں تو بھی ہزاروں آدمی وہاں آپ کے لیے سردردی کا باعث ہوں گے۔ دلی میں اگر آپ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو آٹھ دس آدمی آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔ آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ جب آپ شہر میں داخل ہوں تو کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو کہ آپ بہت امیر ہیں۔

معظم علی نے جواب دیا۔ میں راستے میں دلی کے حالات سن چکا ہوں اور اتنے آدمیوں کو وہاں لے جانے دیا میں علقمندی نہیں سمجھتا۔ میرا ارادہ ہے کہ انہیں اگلی منزل سے واپس کر دوں گا یا راستے کی کس بستی میں چھوڑ دوں گا اور اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس ٹھہرا سکیں تو بہت نوازش ہوگی۔

میزبان نے جواب دیا۔ میرے پاس آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت جگہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی اپنا گھوڑا یہیں چھوڑ دیں۔ میرے گاؤں سے کل اناج کے چند چھکڑے دلی جا رہے ہیں اور اگر آپ ایک عام دیہاتی کا لباس پہننا پسند کریں تو میں آپ کو ان کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔ مجھے ننگے پاؤں چلنے پر کوئی بھی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میرے باقی ساتھی میری واپسی تک یہاں رہے گے۔ پھر وہ اکبر خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ اکبر خاں تم اگر واپس نہیں جانا چاہتے تو تمہیں چند دن یہاں رہنا پڑے گا۔ میں صرف دلاور خاں کو ساتھ لے جاؤں گا۔

اکبر خان نے بضد ہو کر کہا نہیں بھائی جان میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا

۔

آپ دلاور خاں کو میرے نوکروں کے ساتھ چھوڑ دیں۔

معظم علی نے جواب دیا۔نہیں اکبر تمہارا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔

اکبر خاں نے میزبان کی موجودگی میں معظم علی کے ساتھ بحث کرنا پسند نہ کیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہ لوگ ایک چھوتی سے حویلی کے صحب میں سو رہے تھے۔

اکبر خاں نے آواز دی۔بھائی جان!

کیا ہے اکبر؟ تمہیں نیند نہیھں آتی؟ معظم علی نے اپنی چارپائی پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

نہیں بھائی جان! میں سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھے اپنے ستھ کیوں نہیں لے جانا چاہتے۔

اکبر اگر دلی کے حالات ٹھیک ہوتے تو میں یقیناً تمہیں بھی ساتھ لے جاتا۔

دلی کے حالات تو کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔پھر وہاں جانے میں اگر آپ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔

معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔اکبر تمہیں یہاں ٹھرانے کی ایک خاص وجہ ہے۔سنو میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے دل لے جانا خطرناک ہے اور یہ چیز میں تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ تم اس کی حفاظت کرسکو گے۔

اکبر خاں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔وہ کیا چیز ہے بھائی جان؟

ابھی بتاتا ہوں۔یہ کہہ کر معظم علی نے اپنی قمیض کے نیچے کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی اتار دی اور اکبر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔یہ لو!

اکبر خاں نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا کر تھیلی پکڑ لی اور پوچھا اس میں کیا ہے؟

ہیرے معظم علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔اس تھیلی کو اپنی کمر کے ساتھ باندھ لو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

اکبر خاں نے کہا۔اگر یہ سچ مچ ہیرے ہیں تو یقین رکھیے کہ اب آپ کی واپسی تک مجھے ایک لمحہ کیلئے بھی نیند نہیں آئے گی۔

اکبر یہ تمہاری نیند سے زیادہ قیمتی نہیں۔اب آرام سے سو جاؤ اور دیکھو اگر مجھے زیادہ دلی ٹھہرنا پڑا تو میں دلاور خاں کو واپس بھیج دوں گا۔پھر تمہارے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم یہاں ٹھہرنے کی بجائے گھر چلے جاؤ اور میں اگر زندہ رہا تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔

تیسرے دن معظم علی اور دلاور خاں گاڑی بانوں کے لباس میں دلی پہنچے۔شہر کے ناکوں پر مرہٹہ سپاہی باہر سے آنے والے ہر سفید پوش کی تلاشی لیتے تھے اور اس کی جیب سے جو کچھ نکلتا تھا وہ بحق مرہٹہ سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا۔بسا اوقات شہر میں داخل ہونے والوں کو اپنے اجلے کپڑوں کے بدلے کسی مرہٹہ سپاہی کا بوسیدہ لباس زیب تن کرنا پڑتا تھا لیکن شہر میں غلہ، سبزی اور ایندھن پہنچنے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔معظم علی نے جامع مسجد سے تھوڑی دور ایک سرائے میں قیام کیا اور تھوڑی دیر بعد بازاروں، گلیوں اور خانقاہوں میں فرحت اور اس کی ماں کی تلاش شروع کر دی۔اس نے سرائے کے مالک کے توسط سے چند منادی کرنے والوں کو بلایا اور انہیں مرشد آباد کی مرزا حسین بیگ کے کسی شناسا کا سراغ لگانے کے کام پر لگا دیا۔

دلی میں قیام کے دوران میں معظم علی نے مسلمانوں کی زبوں حالی کے جو منظر

دیکھے وہ انتہائی لرزہ خیز تھے۔ نام نہاد شہنشاہ کی حکومت لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ امراء ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ لال قلعہ سے باہر لیٹروں اور راہزنوں کی بادشاہت تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں مرہٹہ سپاہیوں کے گھوڑے دوڑتے تھے۔ شہنشاہ کے تمام احکامات مرہٹہ فوج کے سردار کی خواہشات کے مطابق ہوتے تھے۔ دلی سے آگے مرہٹوں کی جارحیت کا سیلاب لاہور، ملتان اور سرہند کا رخ کر رہا تھا۔ غرض شمالی مغربی ہندوستان، بھیڑیا خصلت انسانوں کے لے ایک وسیع شکار گاہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کے وہ دفاعی قلعے جو اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کیے تھے۔ ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔ دور دراز شہروں اور بستیوں کے لوگ اپنے شہنشاہ اور اس کے وزیروں اور امیروں کے پاس فریادیں لے کر آتے لیکن دلی پہنچ کر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ لال قلعہ کے مکین ان سے زیادہ مجبور، ان سے زیادہ بے بس اور مظلوم ہیں۔ ستم رسیدہ انسانیت کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی۔ انسانیت اور شرافت کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مسلمان چھپ چھپ کر مسجدوں اور بزرگان دین کی خانقاہوں میں دعائیں کرتے تھے علمائے دین احمد شاہ ابدالی کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے۔ مرہٹوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں اب آپ اس ملک کے مظلوم انسانوں کا آخری سہارا ہیں۔

معظم علی آٹھ دن دلی میں سرگرداں رہا۔ اس عرصہ میں اسے مرشد آباد کے کئی آدمی ملے جنھوں نے مرزا حسین بیگ کے ساتھ ہجرت کی تھی لیکن اس سے زیادہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ علالت کے باعث راستے کی ایک بستی میں رک گئے تھے۔

ایک شام معظم علی دن بھر کی جستجو کے بعد سرائے میں پہنچا تو اس کے کمرے میں

ایک عمر رسیدہ آدمی دلاور خاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور خاں نے اٹھ کر کہا جناب یہ مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار ہیں۔ معظم علی کا دل دھڑکنے لگا۔

عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ مرزا حسین بیگ ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ آج میں نے جامع مسجد میں یہ اعلان سنا کہ آپ انہیں تلاش کر رہے ہیں

معظم علی کا دل بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔ مرزا صاحب وفات پا چکے ہیں۔ میں ان کے بال بچوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہے؟

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کے نوکر نے ابھی مجھے ان کے گھر کی تباہی کے واقعات سنائے ہیں۔ اگر ان کا بال بچے آپ کو لکھنوء میں نہیں ملے تو آپ کو حیدر آباد جانا چاہیے۔

معظم علی نے کہا۔ مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی لکھنوء سے ہجرت کر کے حیدر آباد جا چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنوء میں ان کا پتہ کرنے کے بعد حیدر آباد چلی گئی ہوں۔ لیکن میں نے سنا تھا کہ مرزا صاحب کے کئی عزیز دلی میں بھی ہیں۔ آپ کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو زیادہ قریبی ہو ممکن ہے وہ یہاں آئے ہوں؟

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ یہاں مرزا صاحب کے خالو کے دو لڑکے رہتے تھے۔ بڑے کا نام عبدالجبار تھا اور چھوٹے کا نام عبدالکریم تھا۔ عبدالجبار کوئی چار سال قبل فوت ہو گیا تھا اور عبدالکریم اور اس کے خاندان کے باقی افراد ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ دکن میں وہ کہاں رہتے ہیں۔ بہر حال حیدر آباد سے یقیناً آپ کو ان کا سراغ مل جائے گا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں اس سرائے کی بجائے میرے پاس ٹھہریں۔

معظم علی نے کہا۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیکن اب میرے یہاں ٹھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں انشاءاللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

اگلی صبح دلی سے روانہ ہوتے وقت معظم علی نے لال قلعہ کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا کی ۔مولائے کریم! میری قوم کی بے بسی تیری رحمت کو پکار رہی ہے ۔ہمیں ان افراد کی بد اعمالیوں کی سزا نہ دے جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری عزت و آزادی کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہو رہے ہیں ۔لال قلعہ کی دیواریں اس رجل عظیم کی راہ دیکھ رہی ہیں ۔جو ہماری عزت اور بقا کے دشمنوں سے لڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔یہ مایوسی اور بے بسی ہماری میراث ہے اور آج ہمیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو وقت کی آندھیوں اور طوفان سے لڑ سکتا ہے۔ہم تاریک رات کے مسافر ہیں اور ہمیں روشنی کے ایک مینار کی ضرورت ہے۔

○

دو دن پیدل سفر کرنے کے بعد معظم علی دوبارہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا اور چوتھے روز یہ لوگ حیدرآباد کا رخ کر رہے تھے۔کوئی چھ منزل طے کرنے کے بعد گیارہ آدمیوں کے اس قافلے کے ساتھ چھ سوار اور شامل ہو گئے اور انہوں نے یہ بتایا کہ ہم دلی چھوڑ کر نظام کی فوج میں ملازمت حاصل کرنے کے ارادے سے دکن جا رہے ہیں ۔راستے کی بستیوں سے معظم علی کو یہ اطلاع ملی کے قریباً اڑھائی سو مسافروں ک ا ایک قافلہ ایک ہفتہ قبل اس راستے سے گزرا ہے۔راستے میں معظم علی کے نئے ساتھی اس سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔اکبر خاں انہیں مرعوب کرنے کے لیے یہ بتا چکا تھا کہ معظم علی بنگال کی فوج کا ایک بہت بڑا افسر رہ چکا ہے۔

کئی دن کے سفر کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی ایک دوپہر ایک پہاڑی ندی کے کنارے ستانے کے لیے رکے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ درختوں کی چھاؤں میں آرام کرنے کے بعد ہو کوچ کی تیاری کرر ہے تھے کہ انہیں سامنے پہاڑی کے عقب سے کہیں دور بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے۔ وہ جلدی سے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ پہاڑی کی چوٹی سے تھوڑی دور ادھر معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو رکنے کے لیے کہا اور خود گھوڑے سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ اب اسے بندوقوں کی آواز کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر اسے ایک تنگ وادی دکھائی دی۔ وادی کے دائیں طرف ایک پہاڑی کے دامن میں قریباً اڑھائی سو آدمیوں کا ایک قافلہ مرہٹوں کے گھیرے میں آچکا تھا۔ قافلے کے محافظ اور حملہ آور پتھروں اور درختوں کی آڑ سے ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے۔ معظم علی نے زمین پر لیٹ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ حملہ آوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ تھی لیکن قافلے کی طرف سے لڑنے والے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔ معظم علی مڑ کر بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور اس نے کہا۔ اس پہاڑی کے نیچے وادی میں ایک قافلہ گھرا ہوا ہے، تم میں سے دو آدمی گھوڑوں کے پاس رہیں۔ اکبر خاں تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ اس چوٹی سے ذرا نیچے پتھروں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے رہو۔ میں باقی آدمیوں کے ساتھ اس چوٹی سے ذرا نیچے پتھروں اور جھاڑیوں پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بلندی سے ہماری گولیاں حملہ آوروں کے لیے کافی پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے بدحواسی کی حالت میں پیچھے ہٹیں گے لیکن تمھاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اس پہاڑتی کی طرف نہ آسکیں۔ تمہاری گولیوں

سے پریشان ہو کر اگر وہ وادی کی بائیں طرف پسپا ہونے کی کوشش کریں تو سمجھ لینا کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اگر تم نے انہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہماری تعداد بہت کم ہے تو ممکن ہے کہ وہ چند منٹ کے اندر اندر پسپا ہو جائیں اور یہی میں چاہتا ہوں۔

قریباً ایک گھنٹہ کے بعد قافلے کے ساٹھ آدمی ہلاک اور گیارہ زخمی ہو چکے تھے اور مرہٹے ان پر ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے، اچانک ان کے عقب میں پہاڑی کی چوٹی سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور سات آدمی گر پڑے۔ مرہٹے بدحواس ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ پھر دوسری پہاڑی کے دامن سے اکبر خاں اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلائیں اور چھ آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ مرہٹے اپنے دونوں طرف پہاڑیوں کی خطرناک سمجھ کر وادی کے درمیان سمٹنے لگے۔ قافلے کے محافظ حیران ہو کر اپنے دائیں بائیں دونوں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بلند آواز میں چلایا۔ تم کیا دیکھ رہے ہو، اب حملے کا وقت ہے۔ دشمن پسپا ہو رہا ہے۔ قافلے کے محافظوں نے اللہ اکبر، کا نعرہ لگایا اور دشمن پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ پھر چند آدمیوں نے بندوقیں پھینک کر تلواریں نکال لیں اور ان کا پیچھا کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر میدان خالی ہو چکا تھا اور مرہٹے وادی کے نشیب کے گھنے جنگل میں روپوش ہو چکے تھے۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کو گھوڑے لانے کا حکم دے کر بھاگتا ہوا معظم علی کے پاس پہنچا۔ قافلے کے محافظ اب اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ معظم علی کچھ دیر ان کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد قافلے کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر سرخ وسفید رنگ کا ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک پتھر کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے

ہوئے کہا۔تھوڑی دیر پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ خدا اگر ہمیں ان ظالموں سے بچانا چاہتا ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے آسمان سے فرشتے بھیج سکتا ہے، اگر آپ فرشتے نہیں تو میں آپ سے متعارف ہونا چاہتا ہوں۔میرا نام فخر الدین ہے اور میں اس قافلے کے ساتھ حیدر آباد جا رہا تھا۔

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔میرا نام معظم علی ہے اور یہ میرے دوست اکبر خاں ہیں اور ہماری منزل بھی حیدر آباد ہے۔ہمیں افسوس ہے کہ ہم وقت پر نہ پہنچ سکے ورنہ اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔

فخر الدین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔تم شہیدوں کی قبریں کھودنے کا انتظام کرو اور زخمیوں کو ایک جگہ کرو، پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔آپ کے باقی آدمی کہاں ہیں؟

وہ اس پہاڑی کے پیچھے اپنے گھوڑے لینے گئے ہیں

قافلے کی عورتیں اور بچے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔دو لڑکیاں جھاڑیوں سے باہر نکلیں اور بھاگتی ہوئی فخر الدین کی طرف بڑھیں۔بڑی لڑکی جس کے ہاتھ میں بندوق تھی فخر الدین کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گئی اور دوسری جس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ماموں جان! ماموں جان! کہتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار فخر الدین کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔معظم علی نے بڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور وہ بدحواس ہو کر اپنا نقاب درست کرنے لگی۔معظم علی نے دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات نہ کی۔تاہم چند ثانیے ایک حسین اور دلکش تصور اس کی نظروں کے سامنے پھرتی رہی
۔

فخر الدین نے چھوٹی لڑکی سے کہا۔ بلقیس! بیٹی تم جاؤ اپنی ماں کے پاس بیٹھو اور عطیہ کو بھی تسلی دو کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ خدا نے ہمارے مدد کے لیے فرشتے بھیج دیئے ہیں۔

فرشتے؟ بلقیس نے حیران سی ہو کر کہا۔ فرشتے کہاں ہیں؟

فخر الدین نے مسکرا کر معظم علی اور اکبر خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ یہ فرشتے نہیں تو اور کیا ہیں؟

بلقیس نے حیرانی اور تشکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھا او اس کی نگاہیں اکبر خاں کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اکبر خاں اسے سچ مچ ایک فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی بہن کی طرف بڑھی اور فخر الدین نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ان کا باپ فوت ہو چکا ہے اور میں انہیں دلی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ان دونوں دلی میں داخل ہونا معمولی بات نہیں لیکن خوش قسمتی سے پونا کے ایک ہندو تاجر کے ساتھ میرے کاروباری تعلقات تھے اور اس نے مرہٹہ حکومت سے میرے لیے پروانہ راہ داری حاصل کر کے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ دلی سے واپسی پر راستے میں ہمیں یہ قافلہ مل گیا۔ یہ لوگ شمال کے شہروں سے تلاش روزگار کے لیے حیدر آباد جا رہے تھے۔ چلیے زخمیوں کو دیکھیں۔

معظم علی شام سے پہلے ایک منزل اور طے کرنا چاہتا تھا لیکن قافلے کی حفاظت کے خیال سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

○

رات قدرے خنک تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد قافلے کے پڑاؤ میں جگہ جگہ الاؤ

جل رہے تھے۔مرد،عورتیں اور بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان کے گرد جمع تھے۔ چند مسلح آدمی پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔عطیہ،بلقیس اوران کی ماں ایک چھوٹے سے خیمے کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں اور خیمے سے چند قدم دور فخر الدین،معظم علی،اکبر خاں اور چند اور آدمی ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک آدمی نے کہا۔حیدر آباد پہنچ کران یتیموں اور بیواؤں کا کیا بنے گا جن کے سرپرست لڑائی میں مارے جا چکے ہیں؟ ہم سب کو مل کران کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔

فخر االدین نے کہا۔آپ میں سے کسی کو ان کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں حیدر آباد میں ان کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہوگی۔

فخر الدین سے چند سوالات پوچھنے پر معظم علی کو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تاجروں کے ایک بااثر اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور چند سال قبل دلی سے ہجرت کر کے حیدار آباد دکن میں آباد ہو چکا ہے اور اس کا تجارتی کاروبار دکن سے میسور اور کرناٹک تک پھیلا ہوا ہے۔

جب معظم علی نے فخر ادلین کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگذشت بیان کی تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔آپ پریشان نہ ہوں۔اگر آپ کے عزیز حیدر آباد میں ہیں تو میں وہاں پہنچتے ہی ان کا پتہ کر دوں گا۔ حیدر آباد میں آپ میرے مہمان ہوں گے۔

تھوڑی دیر بعد چند آدمی اٹھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس چلے گئے اور باقی وہیں الاؤ کے قریب سو گئے۔فخر الدین دیر تک معظم سے باتیں کرتا رہا۔پہلے بنگال کے حالات زیر بحث آئے اور معظم علی نے میر جعفر کی کٹھ پتلی حکومت کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے۔اس کے بعد اودھ،روہیلکھنڈ اور دلی کے متعلق گفتگو ہوتی

رہی ۔بالآخر دکن کا ذکر آیا اور فخر الدین نے کہا۔دکن ان دنوں شمال اور مشرق سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ ہے ۔دلی کے قدیم شان و شوکت اب آپ کو حیدر آباد میں دکھائی دے گی لیکن میں دکن کے مستقبل کے متعلق زیادہ پر اُمید نہیں ۔کرناٹک کی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اثر ورسوخ اب دکن کے دربار میں بھی پہنچ چکا ہے ۔دوسری طرف مرہٹے بڑی تیزی سے منظم ہو رہے ہیں اور وہ صفر دکن پ رہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔بیرونی خطرات کا سامنا کرنے کے لیے دکن کے پاس وسائل کی کمی نہیں لیکن نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد گذشتہ چند سال میں اس کے بیٹوں کی خانہ جنگی نے مسلمانوں کی اس عظیم دفاعی حصار کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں ۔اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ دکن کے محلاتی سازشوں کا بالآخر نتیجہ کیا ہوگا لیکن میں جس شخص کی کامیابی سے ڈرتا ہوں وہ میر نظام علی ہے ۔اس نے اپنے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ لڑایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جس دن دکن کی حکومت اس کے ہاتھ میں آئے گی ۔وہ قوم کے لیے بنگال کے میر جعفر اور کرناٹک کے محمد علی والا جاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔وہ انگریزوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں جنوب کے مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس بھی نہیں ہوں ۔ہمارے پڑوس میں ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے ۔اگر میرے اندازے غلط نہیں تو ہم بہت جلد گیدڑوں اور بھیڑیوں کی شکار گاہوں میں ایک شیر کی گرج سنیں گے ۔میں ایک ایسے آدمی سے مل چکا ہوں جو ایک بیدار مغز سیاستدان بھی ہے اور ایک اولوالعزم سپاہی بھی ۔

اکبر خاں، جو معظم علی کے قریب بیٹھا اونگے رہا تھا اچانک چونک اٹھا جی وہ

کون ہے؟

آپ اسے نہیں جانتے لیکن اگر وہ چند برس زندہ رہا اور قدرت نے اس کی مدد کی تو وہ جنوب کے مسلمانوں کا آخری محافظ ثابت ہوگا۔اس کا نام حیدر علی ہے اور اس وقت وہ میسور کی فوج کا ایک افسر ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب انگریز اور مرہٹے اسے اپنا ایک طاقت ور اور خطرناک حریف سمجھیں گے۔ابھی جب آپ مجھے بنگال میں اپنی سپاہیانہ زندگی کے واقعات سنا رہے تھے تو میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی دن آپ کی آخری منزل میسور ہوگی۔میں اس سے دوبارہ مل چکا ہوں اور یقین کیجئے کہ میں اپنی زندگی میں کسی اور شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔آپ کی طرح وہ ان طالع آزماؤں کو ملک کا بدترین سمجھتا ہے جو انگریزوں کے ساتھ اپنا سیاسی مستقبل وابستہ کر چکے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔اگر اس کے عزائم اس قدر بلند ہیں تو ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو اپنے ہر محسن کا سر کاٹ کر دشمن کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

پاس ہی خیمے کے اندر عطیہ،بلقیس اور ان کی ماں دن بھر کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔عطیہ نے کہا۔امی جان! ماموں جان ساری رات باہر بیٹھے رہیں گے؟

وہ آجائیں گے بیٹی۔تم اب سو جاؤ۔

بلقیس نے ذرا آگے سرک کر عطیہ کے کان میں کہا۔آپا جان آپ نے فرشتے دیکھے ہیں؟

نہیں لیکن تمہیں اس وقت بیٹھے بیٹھے فرشتوں کا خیال کیسے آیا؟

اس لیے کہ میں نے آج فرشتے دیکھے ہیں۔ دو فرشتے ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور اس وقت وہ ماموں جان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ دیکھیے اُدھر! یہ کہتے ہوئے بلقیس نے خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھا دیا۔

ماں نے کہا۔ پگلی اب آرام سے سو جاؤ۔ انہوں نے ہماری جان بچائی ہے اور تم ان کا مذاق اڑا رہی ہو۔

میں مذاق نہیں کرتی امی جان! ماموں جان کہتے تھے وہ فرشتے ہیں۔

انہوں نے بالکل درست کہا۔ اگر یہ لوگ خدا کی رحمت کے فرشتے بن کر نہ آتے تو اس وقت ہماری لاشیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

O

اگلی صبح یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ کوئی چار کوس چلنے کے بعد یہ لوگ ایک چھوتی سے بستی میں داخل ہوئے۔ چند زخمی گھوڑوں پر سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ فخر الدین کی درخواست پر گاؤں کے زمیندار نے معقول کرائے پر سات بیل گاڑیاں مہیا کر دیں۔ زخمیوں کے علاوہ قافلے کی چند عورتیں اور بچے جو گھوڑوں پر طویل سفر کرنے سے تنگ آ چکے تھے بیل گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ایک گاڑی میں فخر الدین کی بہن اور بھانجیاں بیٹھ گئیں۔

گاؤں کے لوگوں سے استفسار پر معظم علی کو یہ معلوم ہوا کہ مرہٹہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ کہیں باہر سے آئے ہیں اور دو دن قابل اس گاؤں سے دس کوس شمال کی طرف ایک چھوٹے سے شہر کو لوٹ چکے ہیں۔

اگلے منزل پر ایک زخمی نے جس کی حالت بہت نازک تھی دم توڑ دیا۔ اس کے دو دن بعد ایک اور زخمی چل بسا۔

حیدرآباد پہنچتے پہنچتے معظم علی قافلے کے ہر بچے اور بوڑھے کی نگاہ میں ایک ہیرو بن چکا تھا۔ مسلح آدمی اسے اپنا کمانڈر تصور کرتے تھے۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے وہ ایک سعادت مند بیٹا اور نوجوانوں اور کمسن بچوں کے لیے وہ ایک شفیق بھائی بن چکا تھا۔ بلقیس کبھی کبھی گاڑی کا پردہ سرکا کر اکبر کی طرف دیکھتی اور عطیہ کے کان میں کہتی۔ اپا جان وہ یقیناً کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کبھی کبھی وہ پیدل چلنے کے بہانے گاڑی سے کود پڑی اور پھر تھوڑی دور بھاگنے کے بعد فخر الدین سے کہتی ماموں جان میں گھوڑے پر سواری کروں گی اور فخر الدین کے نوکر اسے گھوڑے پر سوار کرا دیتے۔ پھر وہ اکبر خان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتی۔ حیدرآباد ابھی یہاں سے کتنی دور ہے؟ آپ نے ہمایوں کا مزار دیکھا ہے؟ لال قلعہ اور جامع مسجد دیکھی ہے؟ ماموں جان کہتے تھے کہ آپ شیر کا شکار کھیلا کرتے ہیں کبھی آپ نے ہاتھی بھی مارا ہے؟

ایک دن اس نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ بھلا یہ درست ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟

اکبر خاں اس سوال پر ہنس پڑا اور بلقیس کا معصوم چہرہ حیا سے تمتما اٹھا۔

کیا بات ہے اکبر؟ معظم علی نے اپنے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

کچھ نہیں۔ اس نے جواب دیا۔ یہ پوچھتی ہے میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔

معظم علی نے کہا۔ اس میں اس کا قصور نہیں۔ آجکل دلی کا ہر تیسرا آدمی یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

بلقیس کو اکبر خاں کی ہنسی اور اس سے زیادہ معظم علی کی مداخلت پسند نہ آئی اور

اس نے مڑ کر ایک نوکر کو آواز دی، یہ گھوڑا سنبھالو میں گاڑی پر جاتی ہوں۔

جب وہ گھوڑے سے اتر کر گاڑی پر سوار ہو رہی تھی تو عطیہ نے بگڑ کر کہا۔بس گھوڑے کی سواری کا شوق پورا ہو گیا؟

بلقیس کچھ دیر منہ بسور کر بیٹھی رہی ۔ بالآخر اس نے کہا۔آپا جان وہ دونوں گنوار ہیں۔

عطیہ ہنس پڑی لیکن ماں نے ڈانٹ کر کہا بڑی بدزبان ہو تم۔

تھوڑی دیر بعد عطیہ نے اس کے کان میں کہا۔چڑیل سچ بتاؤ کیا کہا تھا تم نے اس سے؟

میں نے اسے کیا کہا تھا!

اچھا تمھارے بادشاہ سلامت کو بلا کر یہ کہوں کہ ملکہ عالیہ خفا ہو کر بیل گاڑی پر سوار ہو گئی ہیں۔

امی جان! بلقیس نے احتجاج کے لہجے میں کہا۔آپا جان مجھے گالیاں دیتی ہیں

۔

ماں نے کہا۔عطیہ چھوڑو اسے تنگ نہ کرو۔

○

حیدر آباد پہنچ کر معظم علی نے فخر الدین کی جو شان و شوکت دیکھی وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ دو منزلہ رہائشی مکان کے ساتھ اس کا مہمان خانہ اس قدر وسیع تھا کہ وہاں بیک وقت سو مہمان ٹھہر سکتے تھے۔ مہمان خانے کے ساتھ اس کا وسیع دفتر تھا جہاں آٹھ دس منشی کام کرتے تھے وہ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ اسلحہ، بارود، ریشم، صندل اور گرم مسالے کی تجارت کرتا تھا۔گلی کی دوسری طرف

ایک وسیع حویلی میں اصطبل اور گودام تھے۔جب یہ قافلہ حیدا آباد پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔فخر االدین کا ایک نوکر چند گھنٹے پہلے گھر پہنچ کر اس کی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔اس کے نوکر مہمان خانے کی نچلی منزل میں قافلے کے لاوارث بچوں،عورتوں اور بے سہارا آدمیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر چکے تھے۔معظم علی اور اکبر خاں کو بالائی منزل میں جگہ دی گئی اور ان کے نوکر فخر الدین کے نوکروں کے ساتھ دوسری حویلی میں چلے گئے۔قافلے کے باقی لوگ حیدر آباد میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو رخصت ہو چکے تھے۔

رات کے وقت اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد فخر االدین نے معظم علی سے کہا۔اب آپ آرام سے سو جائیں۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علی الصباح آپ میرے علاوہ جس دوسرے آدمی کو پہلے دیکھیں گے،وہ مرزا حسین بیگ کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔

معظم علی نے کہا لیکن حیدر بہت بڑا شہر ہے۔آپ اتنی جلدی کیسے پتہ لگا لیں گے؟

فخر الدین نے جواب دیا۔آپ اطمینان رکھیں۔میرے پاس ڈیڑھ سو نوکر ہیں اس کے علاوہ میں ابھی شہر کے کوتوال اور فوج کے چیدہ چیدہ افسروں کے پاس جاتا ہوں،اگر مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار حیدا آباد ہیں تو انہیں تلاش کرنے کے لیے ایک رات کافی ہے۔

تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود معظم علی کو دیر تک نیند نہ آئی۔پھر صبح جب اس کی نیند کھلی تو سورج کافی اوپر آچکا تھا۔کمرے میں دوسرے بستر پر اکبر خاں ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا

۔کہ فخر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار مل گئے ہیں وہ صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ان کے ساتھ ان کے لڑکے بھی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے۔میں نے جگانا مناسب نہ خیال کیا۔اب چلیے وہ نیچے بیٹھک میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

میری نیند اس قدر اہم نہ تھی۔معظم علی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔انہوں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟

فخر الدین نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔انہیں مرزا حسین بیگ بچوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

معظم علی ایک ثانیے کے لیے لیٹے ہوئے مسافر کی طرح فخر الدین کی طرف دیکھتا رہا۔

مجھے افسوس ہے۔فخر الدین نے کہا۔چلیے!

معظم علی، فخر الدین کے ساتھ نیچے اتر کر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔تین عمر رسیدہ آدمی اور پانچ نوجوان قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔وہ معظم علی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔معظم نے یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔میرا خیال تھا کہ مرزا حسین بیگ کے بچے حیدر آباد پہنچ گئے ہوں گے۔مرشد آباد چھوڑنے کے بعد وہ لکھنوء کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کی تلاش میں لکھنو پہنچا تو وہاں سے ان کے رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے۔مرزا صاحب کے متعلق مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔میں فیض آباد، آگرہ اور دلی کے علاوہ کئی شہروں میں انہیں تلاش کر چکا ہوں۔

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔لکھنو میں ان کا رشتہ دار میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا

میں مرزا صاحب کا ماموں زاد بھائی ہوں لیکن بدقسمتی سے میں پلاسی کی جنگ سے پہلے لکھنو چھوڑ کر یہاں آ کر چکا تھا۔

معظم علی نے پوچھا۔آپ راشد بیگ ہیں؟

جی ہاں۔

آپ میں سے عبدالکریم کون ہیں؟

دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ میں ہوں لیکن مجھے بھی مرزا حسین بیگ کی بیوی اورلڑکی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں آتے اور ہمیں نہ ملتے۔

تیسرے آدمی نے معظم علی سے سوال کیا۔آپ محمود علی خاں کے بیٹے ہیں؟

جی ہاں۔معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

اس نے کہا۔میں شوکت بیگ کا باپ ہوں۔

معظم علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اوسوال کیا۔آپ یہاں کب آئے؟

مجھے پلاسی کی جنگ سے چند ہفتے بعد ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ میں نے بنگال چھوڑتے وقت مرشدآباد میں مرزا حسین بیگ کا پتہ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ لکھنو پہنچ گئے ہوں گے اور وہاں جا کر بھی میں نے انہیں تلاش کیا تھا۔

معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔اور میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ڈھاکہ جا کر ان کا پتہ کروں گا۔

مرزا حسین بیگ کے رشتہ داروں سے ملنے کے بعد معظم علی کی حالت اس مسافر کی سی تھی جس کے سامنے کوئی منزل یا راستہ نہ ہو۔اسے حیدرآباد کی پر رونق

گلیاں اور بازار سنسان نظر آتے تھے۔فخر الدین، مرزا حسین بیگ کی بیوی اور صاحبزادی کا پتہ دینے والے کو پانچ سو اشرفیاں انعام دینے کا اعلان کر چکا تھا اور شہر میں منادی کرنے والے گلی گلی گھوم رہے تھے لیکن فرحت اور اس کی ماں کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اکبر خاں کے لیے حیدر آباد پر رونق شہر ایک بہت بڑا عجائب گھر تھا وہ صبح سویرے اٹھتا اور کسی نوکر کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔اسے حیدر آباد کی فوجی تربیت گاہ میں نوجوان افسروں کی نیزہ بازی، شہسواری اور چوگان کے کھیل بہت پسند تھے۔کبھی وہ فخر الدین کے اصطبل میں جاتا اور کسی شوخ اور تند گھوڑے پر سوار ہر کر سیر کے لیے چلا جاتا۔اسے معظم علی کے رنج و کرب کی بری شدت کے ساتھ احساس تھا اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن معظم علی کے ساتھ بیکار بیٹھا ان اس کے بس کی بات نہ تھی۔وہ اکثر یہ کہتا بھائی جان! آج فلاں جگہ نیزہ بازی ہو رہی ہے۔آج فلاں میدان میں فوج کے افسر چوگان کھیل رہے ہیں۔آج فخر الدین کے اصطبل میں چند نئے گھوڑے آئے ہیں، چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔

معظم علی کبھی کبھی دل پر جبر کر کے اس کا ساتھ دیتا لیکن عام طور پر اس کا یہی جواب ہوتا۔اکبر تم جاؤ میری طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔

○

ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔اکبر خاں کہیں باہر گیا ہوا تھا اور معظم علی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔اس کے کمرے کے سامنے طویل برآمدے کا ایک سرا رہائشی مکان سے ملا ہوا تھا۔اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور معظم علی کمرے سے ایک کرسی نکال کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دائیں ہاتھ برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھلا اور بلقیس جھجکتی شرماتی ہوئی آگے بڑھی۔

آؤ بلقیس! معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر پیار سے کہا۔ میں نے تمہیں کل سے نہیں دیکھا کہاں غائب تھیں تم؟

بلقیس نے جواب دیا۔ کل آپا جان کو بخار تھا اور میں ان کے پاس تھی۔

اب کیسی ہیں وہ!

اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ امی جان پوچھتی ہیں۔ آپ کی طبعیت ٹھیک ہے نا؟

ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ماموں جان کہتے تھے کہ آپ یہاں سے بہت جلد چلے جائیں گے؟

ہاں! میرا ارادہ ہے کہ میں اگلے ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔

نہیں آپ نہ جائیں ح۔ بلقیس نے منہ بسور کر کہا۔ اگر آپ یہاں ٹھہریں تو آپ کے رشہ دار ضرور مل جائیں گے۔ میں ہر روز یہ دعا کرتی ہوں کہ آپ کے رشتہ دار آپ کو مل جائیں۔ امی جان اور آپا جان آپ کے لیے دعا کیا کرتی ہیں اور میں بھی یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں۔

معظم علی مسکرایا۔ بلقیس تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میرے لیے حیدر آباد ٹھہرنے کی دعا نہ کیا کرو۔

کیوں آپ کو حیدر آباد پسند نہیں؟

حیدر آباد بہت اچھا شہر ہے لیکن میں یہاں ایک مسافر ہوں۔

بلقیس نے مایوس ہو کر کہا۔ آپ کو گھر یاد آتا ہوگا؟

میرا کوئی گھر نہیں۔ معظم علی نے جواب دیا۔

تو پھر آپ یہاں کیوں نہیں رہتے ۔

میں لکھنوء جانا چاہتا ہوں ۔

لکھنوء میں آپ کے رشتہ دار ہوں گے؟ بلقیس نے کہا۔

نہیں ۔

بلقیس نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ماموں جان آگئے!

معظم علی نے صحن کی طرف دیکھا۔فخر الدین ایک چھتری اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معظم علی اٹھ کر کمرے سے دوسری کرسی نکال لایا۔فخر الدین اوپر پہنچا تو بلقیس وہاں سے چلی گئی۔

فخر الدین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔اکبر خاں کہاں ہے؟

جی وہ بارش سے تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے اصطبل میں گھوڑے دیکھ رہا ہوگا۔

اسے گھوڑوں کا بہت شوق ہے، میں اسے عربی نسل کا ایک بہترین جوڑا دینا چاہتا ہوں ۔ بڑا ہونہار لڑکا ہے۔اگر آپ اسے میرے پاس چھوڑ دیں تو میں اسے چند برس میں ایک کامیاب تاجر بنا سکتا ہوں ۔اسے گھوڑوں کی تجارت کا شوق بھی ہے۔

یہ شوق اسے اپنے باپ سے ملا ہے۔

فخر الدین نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

فرمائیے۔

فخر الدین نے تھوڑی دیر گردن جھکانے کے بعد کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں

حیدرآباد میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ کسی گم میں گھلے جا رہے ہیں ۔آپ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں قدرت نے پہاڑوں کے سینے چیرنے کی ہمت عطا کی ہے ۔زندگی سے آپ کی یہ بیزاری بڑی افسوسناک ہے میں ابھی سپہ سالار سے مل کر آ رہا ہوں ۔ میں نے ان اسے آپ کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے آپ کی سرگزشت سننے کے بعد یہ کہا تھا کہ اگر ایسا نوجوان حیدرآباد کی فوج میں شامل ہونا پسند کرے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی ۔وہ آپ کی بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کا مستقبل بہت روشن ہوگا اور آپ اپنی اداس اور مغموم زندگی میں نئی دلچسپیاں تلاش کر سکیں گے ۔

معظم علی نے جواب دیا ۔زندگی کے ساتھ میری دلچسپیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں لیکن میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں آئندہ فوج کی ملازمت نہیں کروں گا ۔ میرے لیے اپنے ان عزیزوں اور دوستوں کی بے مقصد قربانیوں کی یاد کافی ہے جن کا خون بنگال کی خاک میں جذب ہو چکا ہے ۔

فخر الدین نے پھر تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا ۔یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے اور شاید آپ کو بھی عجیب معلوم ہو لیکن ہم جس دور سے گزر رہے ہیں ۔وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قدیم رسم و رواج کی دیواریں توڑ رہا ہے ۔میری اور مجھ سے زیادہ میری ہمشیرہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ کو ان کی بڑی لڑکی کا شریکِ حیات بنا دیا جائے ۔اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ نے ہماری جانیں بچائی ہیں بلکہ اس لیے کہ اپنی یتیم بھانجی کے لیے آپ جیسا نیک اور قابل اعتماد رفیقِ حیات تلاش کر لینا قدرت کا ایک انعام سمجھتا ہوں اور اپنی بھانجی کے متعلق اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک نیک ماں اور شریف باپ کی بیٹی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ

میں اس کے لیے کسی ریاست کے مالک کا دروازہ کھٹکھٹا سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اسے اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ آپ جیسے سلیم الفطرت انسان کے ساتھ ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے گی۔

معظم علی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فخر الدین کی طرف دیکھا اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے روئے زمین کے تمام پہاڑ اٹھا کر میری گردن پر رکھ دیئے ہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔آپ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ دنیا آج بھی فرشتوں کے وجود سے خالی نہیں لیکن میں اس مسئلے میں بے بس ہوں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زبان سے انتہائی دیانت دارانہ جواب بھی شرافت اور انسانیت کا منہ نوچنے کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ یہ چند برس کی بات ہے۔میرا ایک دوست جو مجھے بھائی کی طرح عزیز تھا، لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد میری گود میں سر رکھ کر دم توڑ رہا تھا۔اس دنیا میں اسے اپنی ایک بہن سب سے زیادہ عزیز تھی اور اس کی آخری کواہش یہ تھی کہ میں اس کے مستقبل کا امین بنوں۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ گڑیا کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے بھائی کی آخری خواہش پوری ہوگی لیکن کچھ عرصہ بعد میں گرفتار اور پھر مرہٹوں کی قید سے نکل کر گھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اس کے بعد دنیا میرے لیے تاریک ہو چکی تھی۔پھر ایک دن ایسا ہوا کہ جب میں اس لڑکی کا منگیتر ایک ہی محاذ پر مرہٹوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے کسی بات میں کم نہ تھا اور ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن چکے تھے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اس کے ہونے والے شوہر کے

لیے اپنے دل میں ایک بھائی کی شفقت محسوس کرتا تھا۔ یہ نوجوان ایک لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ہمارے والدین ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے ہی تھے کہ بنگال میں انقلاب آگیا۔

فخر الدین نے متاثر ہوکر کہا اور وہ لڑکی مرزا حسین بیگ کی بیٹی تھی؟

جی ہاں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

تھوڑی دیر بعد فخر الدین اٹھ کر زنا نخانے میں چلا گیا اور معظم علی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ معظم علی نے عطیہ کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا۔ تاہم اس کی معمولی جھلک بھی کسی نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی تھی لیکن معظم علی کے پہلو میں وہ دل نہ تھا۔ عطیہ بہت کچھ تھی لیکن وہ فرحت نہ تھی۔

فرحت! فرحت!! وہ اپنے تصور میں اسے آوازیں دیتا ہوا اٹھا اور کمرے کے اندر جا کر بستر پر گر پڑا۔ فرحت! فرحت!! تم کہاں ہو؟ کاش میری آواز تمہارے کانوں تک پہنچ سکتی۔

اگلے روز رات کے وقت معظم علی اور اکبر خاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے فخر الدین اندر داخل ہوا اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ معظم علی حیدر آباد کی فوج میں ملازمت کے متعلق تم میری تجویز رد کر چکے ہو لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں بیکار بیٹھ کر چین نصیب نہیں ہوگا۔ اگر تم تجارت شروع کرنا چاہو تو میں تمہیں اور اکبر خاں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ شریک ہونا پسند نہیں کرتے تو میں تمہیں بڑی خوشی سے قرض حسنہ کے طور پر ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہون۔ تم جب چاہو مجھے واپس کر دینا۔ میں صرف یہ

چاہتا ہوں کہ کسی کام میں تمہارا جی لگ جائے۔

معظم علی نے جواب دیا۔تجارت کے متعلق میں بھی چند دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ممکن ہے کہ میں یہیں سے ابتدا کروں اور لکھنوء جاتے ہوئے اپنے ساتھ چند گھوڑے لیتا جاؤں اور سرمائے کے لیے میں آپ کو تکلیف دینا پسند نہیں کروں گا ۔

لیکن سرمائے کے بغیر تو تجارت نہیں ہوتی۔

سرمایہ میرے پاس کافی ہے۔معظم علی نے یہ کہتے ہوئے اپنی قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی نکالی اور اس میں سے ایک ہیرا نکال کر فخرا لدین کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا آپ کا خیال میں اس کی قیمت کیا ہوگی؟

فخر الدین نے چراغ کی روشنی میں ہیرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔اگر آپ کے پاس اس قسم کے آٹھ دس اور ہیرے ہوں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ لکھنوء کے امیر تین آدمی ہیں۔

معظم علی نے کہا۔اس تھیلی میں تیس ہیرے ہیں لیکن مجھے ان کی کوئی پہچان نہیں۔میں نے ایک ہیرا جو اس سے ذرا چھوٹا تھا لکھنوء میں بارہ سو اشرفی کے عوض بیچا تھا اور اس ہیرے کو فروخت کرنے کے لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔

لکھنوء میں آپ کو کسی نے ٹھگ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ہیرے کے عوض میں آپ کو پانچ گنا زیادہ دلا سکوں گا۔

معظم علی نے اس کے ہاتھ میں تھیلی دیتے ہوئے کہا۔انہیں بھی دیکھ لیجیے!

فخر الدین نے تھیلی پر الٹنے کے بعد کہا یہ ہیرے بہت قیمتی ہیں لیکن آپ نے لیے کہاں سے؟

معظم علی نے جواب دیا۔ یہ ابا جان کو سراج الدولہ کا آخری انعام تھا۔

فخر الدین نے کہا۔اب مجھے مہمان خانے پر پہرا لگانا پڑے گا۔آپ نے کسی اور کو تو نہیں بتایا؟

نہیں۔

آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔

.....................اختتام حصہ اول............

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006